تساہل سے کام لیا گیا ہے، مثلاً ص ۳۰ پر حدیث طیر درج ہوگئی ہے جو ایک موضوع روایت ہے، ص ۱۰۴ کے بعد آٹھ صفحے شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اور ص ۲۰۴ کے بعد کے آٹھ صفحے مکرر شامل ہوگئے ہیں، دوسری کتاب میں نماز اور اسکے متعلقات وضو، اذان، جماعت، امامت اور مسجد کے مسائل و احکام درج ہیں، اس میں پنجوقتہ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل، تراویح، وتر، جمعہ، عیدین، جنازہ، استسقاء، مریض اور مسافر کی نمازوں کا بیان بھی ہے، نماز کے ضروری آداب و ارکان، اعتدال، خشوع و خضوع کے علاوہ فرض نمازوں اور جماعت ترک کرنے والے کے احکام لکھے ہیں، اور صحابہ و تابعین، محدثین اور ائمہ کے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے اور نوافل کا اہتمام کرنے کا حال بھی دیا ہے، اس مختصر رسالہ سے نماز اور اسکے سلسلہ کے اکثر اہم اور ضروری مسائل معلوم ہو جاتے ہیں، مگر جن نمازوں کو پڑھنے کا کم اتفاق ہوتا ہے اگر انکی دعائیں اور طریقے واضح انداز میں لکھ دئے گئے ہوتے تو اسکا فائدہ اور بڑھ جاتا، ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کو مانتی ہے، اگر مختلف فیہ مسائل میں انکے مسلک کا ذکر بھی آجاتا تو بہتر ہوتا، تیسری کتاب میں قیامت کے احوال، نظام عالم کے تہ و بالا ہونے، حشر و نشر، جنت و دوزخ اور اہل جنت و اہل جہنم کے انجام اور قیامت کی ہولناکی وغیرہ کا ذکر ہے، یہ تینوں رسالے عام فہم انداز اور دلنشین پیرایہ میں لکھے گئے ہیں، عام مسلمانوں کیلئے انکا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت : دار المصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت : ماہانہ

نام پرنٹر : اقبال احمد

قومیت : ہندوستانی

پتہ : دار المصنفین اعظم گڈھ

نام پبلشر

اڈیٹر : " " سید صباح الدین عبدالرحمن

قومیت : ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ : دار المصنفین اعظم گڈھ

میں اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ اقبال احمد

جلد ۱۲۹ ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ مطابق اپریل ۱۹۸۲ء عدد ۴

مضامین

شذرات

شروع اپریل میں پاکستان ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی کہ جناب سید حسام الدین راشدی اللہ کو پیارے ہوئے، یہ خبر راقم حروف کے لیے بڑی جانکاہ تھی۔

وہ دارالمصنفین کے بڑے قدردان اور پرستار رہے، انھوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ ان کا شمار کرنا آسان نہیں، مگر کہتے کہ خدائی قسم میں نے دارالمصنفین کی کتابوں ہی سے لکھنا سیکھا، وہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے مداح تھے، دارالمصنفین سے جو بھی کتاب شایع ہوتی اس کو ضرور منگواتے اور اپنی الماری میں نمایاں جگہ دیتے، اس ادارہ سے غیر معمولی محبت کی وجہ سے ۱۹۴۷ء کے بعد کراچی میں اس کے لیے زمین کا ایک بڑا پلاٹ خرید لیا تھا کہ وہ اس کو وہاں منتقل کرالیں، لیکن یہ وہاں کیوں منتقل ہوتا، آخر میں وہ برابر کہتے رہتے کہ یہ ہندوستان ہی میں رہ کر بہتر کام کرسکتا ہے، اور اس کو اسی سرزمین میں رہنا چاہیے جہاں قائم ہوا ہے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے ناشرین نے اس ادارہ کی مطبوعات کو چھاپ کر جو نقصان پہونچایا اس سے وہ بہت رنجیدہ رہے، ان کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے ایک کمیٹی بنائی، جب یہ موثر نہ ہوسکی تو وہاں کے تمام انگریزی اور اردو کے اہم اخبارات میں مضامین لکھے کہ حکومت پاکستان اس ادارہ کی مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت خرید کر اس کو گراں قدر معاوضہ دے، یہ اخباری مہم ایسی مفید ثابت ہوئی کہ اس خاکسار کو حکومت پاکستان نے اسلام آباد بلایا اور ایک طویل مدت کی دفتری کارروائی کے بعد پندرہ (۱۵) لاکھ روپیے دارالمصنفین کو دے کر اس کی مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت اپنے ایک ادارہ نیشنل بک فونڈیشن کے سپرد کردیا۔

اس کے لیے دارالمصنفین زیادہ تر جناب سید حسام الدین راشدی کا شکر گذار رہا، اس سلسلہ میں اس عاجز راقم کو جب جب کراچی جانا پڑا تو ان کی صحبت کی صبح حسین، شام رنگین اور رات عنبر آفریں رہی، وہ اپنے بے پایاں کرم و محبت کی بنا پر کراچی کے اہل علم کو اپنی آراستہ و پیراستہ کوٹھی میں پر تکلف کھانے پر مدعو کرتے اور اس دعوت کو اپنی بذلہ سنجیوں، علمی پھلجھڑیوں اور پر کیف قہقہوں سے زعفران زار بنادیتے، کبھی تنہائی میں ان کی نوشت و خواند کے پرسکون گوشۂ عافیت میں جا بیٹھتا تو پھر اس میں علم و فن کی مہتابی چھٹکی نظر آتی، ہم دونوں محسوس کرتے کہ ہماری زندگی کے بہترین لمحات گذر رہے ہیں، کراچی سے واپس آکر معارف کے صفحات پر لطف و لذت کے ساتھ ان کا ذکر کرنے میں قلم بالکل نہیں تھکتا۔

وہ فرماتے کہ اگر وہ دارالمصنفین کی زیارت اپنی زندگی میں کرلیں گے تو پھر چین کی ابدی نیند سوئیں گے، یہاں کے بین الاقوامی سیمنار میں ان کو مدعو کیا تو فوراً جواب دیا کہ اس میں ان کی شرکت اس لیے ہوگی کہ وہ اپنے ذہنی قبلہ کا طواف کرلیں گے، مگر ان کے بعض خطرناک آپریشن ہونے والے تھے، جس کی کامیابی کی امید خود ان کو نہ تھی، وہ یہاں آنے کے بجائے وہاں پہونچ گئے جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، ان چند تعزیتی سطروں کو لکھ کر مجھ پر ان کا جو حق ہے وہ ادا نہ ہوسکے گا، میرا بس چلتا تو ان پر ایک ضخیم کتاب لکھتا، ان شاء اللہ معارف کی کسی اشاعت میں ان پر ایک طویل مضمون ہوگا، ان کی وفات علمی تحقیق، علمی محنت، علمی ریاضت، علمی موشگافی، علمی نکتہ پروری کے ساتھ علم دوستی، دوست پروری، اخلاق کی رعنائی، اخلاص کی دلآویزی اور پرانی قدروں کی دلربائی کی بھی موت ہے، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنی آغوش رحمت میں لے کر کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کرے، آمین۔

ان کی وفات کے ساتھ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی کی رحلت کی بھی خبر ملی، وہ ہندوستان کے مشہور بزرگ عالم، واعظ اور ندوۃ العلماء کے بڑے عربی مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ کے فرزند ارجمند تھے، ندوہ سے سند حاصل کرکے کپورتھلہ کی جامع مسجد کے امام ہوئے تو اسی امامت سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا اور جب

پاکستان بنا تو ایک جید عالم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ اور ممتاز مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوئے، بہت دنوں تک لاہور کے ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ رہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہوئے جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں آلدین یسر، ریاض السنۃ، پیغمبر انسانیت، ازدواجی زندگی کے لیے قانونی تجاویز، مسئلۂ تعدد ازدواج، تحدید نسل، اجتہادی مسائل، زیردستوں کی آقائی، تجربہ الفخری وغیرہ، وہ قدیم وجدید طرز فکر کے امتزاج کے خواہاں تھے، اس کی ترویج کرتے رہے کہ شریعت کو غیر متبدل نہ سمجھا جائے بلکہ اس میں جو توسع اور تیسیر رکھا گیا ہے اسے آج بھی باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، ان کی بعض تحریروں سے دینی حلقوں میں ہلچل پیدا ہوتی رہی مگر وہ جہاں پہونچ جاتے اپنی شیریں بیانی سے اپنے ہم نشینوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے، اچھے مقرر اور واعظ بھی تھے، کلام پاک کی آیتیں خوش الحانی اور اشعار ترنم سے پڑھ کر بڑی کیفیت پیدا کر دیتے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارش فرماتے رہیں آمین۔

پاکستان ہی میں اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کی وفات ہوئی، انھوں نے اردو شاعری کی صنف نظم گوئی کو بڑی ترقی دی، غزل گو کے بجائے نظم گو کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوئے، ان کے مداح ان کے فن اور شاعرانہ مہارت کے بڑے قدر دان ہیں، مگر ان کے کچھ ناقد ایسے بھی ہیں جو ان کی شاعری میں خیالات کی بلندی اور پاکیزگی کے بجائے صرف گھن گرج اور چیخ و پکار زیادہ پاتے ہیں، دینی حلقوں میں تو اپنے ملحدانہ اور رندانہ طرز فکر کی وجہ سے اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے، مگر جب کبھی اردو شاعری کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ان کے شاعرانہ فن کی وجہ سے ان کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔

آج کل رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری پر بھی ماتم بپا ہے، وہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ اردو شاعری کی بہت سی رعنائیاں اور جلوہ سامانیاں بھی ساتھ لیتے گئے، فانی، اصغر، جگر اور حسرت کے بعد اردو شاعری کے لال قلعہ کے تخت طاؤس پر بیٹھ کر وہی شاہجہانی کرتے رہے، زبان کی زور آوری، فن کی ہمہ گیری، احساسِ جمال کی مرقع آرائی، رومانیت اور کلاسکیت کی ہم آہنگی، غزل گوئی کی آیندہ ساخت و پرداخت میں رہبری، کیفیت و حلاوت کی رنگ آمیزی اور اردو زبان کی بے پناہ محبت کی فراوانی میں وہ یگانۂ روزگار رہے، وہ خود کہہ گئے ہیں

> کچھ درد دے گیا ہوں زمانے کو اے فراق ؛ یہ سوچ کر کہ بعد میں یہ کام آئیں گے

مقالات

مستشرقین اور طبِ اسلامی

از

جناب حکیم محمد سعید دہلوی، ہمدرد فونڈیشن، کراچی (پاکستان)

ہمارے اسلاف نے قرآن کریم کی روشنی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے فیض سے عالم انسانیت کو جو تہذیب عطا کی اور علوم و فنون کے میدانوں میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے وہ تاریخ عالم کا بیش بہا ذخیرہ ہیں، لیکن مختلف وجوہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مسلمانوں میں سیاسی انحطاط کے ساتھ علمی لگن میں بھی کمی ہوئی تو وہ علمی پیش رفت تو رہی ایک طرف، اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی بیگانہ ہونے لگے اور ان کو مسلمان مشاہیر علم و ادب کی خدمات کا علم و اندازہ بھی نہیں رہا۔

اقوامِ مغرب نے سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ علم و دانش میں بھی برتری حاصل کرنے کی سعیِ پیہم کی، اس کیلئے ایک طرف تو مغربی اہل علم نے مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں، دوسری طرف وہ خود علمی تلاش و تحقیق و کدو کاوش میں مصروف ہوگئے، اپنی علمی برتری اور اپنے اخلاقی تفوق کو ظاہر و ثابت کرنے کا ایک طریقہ انھوں نے یہ بھی نکالا کہ مسلمان اکابر و مشاہیر کے کارناموں پر تحقیق شروع کی اور اپنی تحقیق کے نتائج کو انکشافات کے انداز میں خود مسلمانوں کے سامنے بھی پیش کیا،

"خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" کے مصداق ان کے اس طرزِ فکر وعمل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ خود مسلمان اہل علم کو بھی اپنے اسلاف کی عظمت پر توجہ ہوئی اور ان کو احساس ہوا کہ ان کے بزرگوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کو مستشرقین نے تسلیم کرنے میں کتمانِ حق سے خوب خوب کام لیا ہے، عالم اسلام میں بیداری اور احساس زیاں کی موجودہ لہر نے ہمیں ایک بار پھر موقع دیا ہے کہ ہم مستشرقین کے کارناموں کا بامعانِ نظر مطالعہ کرنے کے بعد حقایق کو تجزیہ وتحلیل کی چھلنی میں چھاننے کی کوشش کریں اور توازنِ فکر کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے حقایق تک پہنچنے کی کوشش کریں، 'اسلام اور مستشرقین' پر یہ بین الاسلامی موتمر مسلمان اہل علم کو ایک زریں موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کے باب میں ایک جامع لائحۂ عمل تیار کریں۔

میرا موضوع 'مستشرقین اور اسلامی طب' ہے، میں نے اس میں اختصار کے ساتھ مستشرقین کے کام کا دیانتدارانہ اور فراخ دلانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے' اور کیڑے نکالنے کی ذہنیت اختیار نہیں کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی طب کی ایک مبسوط اور جامع تاریخ مرتب کریں اور اس میں مسلمان اطباء وحکماء کے کاموں کو صحیح علمی وتاریخی پس منظر میں پیش کریں، صرف اسی طرح ہم اس کوتاہی کی تلافی کر سکیں گے جو ہم نے اپنی علمی تاریخ کی تدوین سے غافل وبے نیاز ہو کر کی ہے، ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے میرا اندازِ فکر یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی کوتاہیوں، گمراہیوں اور جانب داریوں کی تنقید پر عطف توجہ سے زیادہ مثبت انداز میں خود علمی پیش رفت کی جانب مائل ہونا چاہیے، صرف اسی طرح ہم بعض مستشرقین کے ایسے کاموں اور ان کے مضر اثرات کا بھی ازالہ کر سکیں گے جو انھوں نے اپنے مخصوص مصالح اور مفادات کی بنا پر ہماری علمی تاریخ پر مرتب کیے ہیں۔

'لیگسی آف اسلام' کے ایک مقالہ نگار اور معروف مستشرق 'الفرڈ گیلم' نے بڑے محتاط انداز میں اور بڑی دبی زبان سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ گیارہویں صدی میں یورپ میں قائم کی جانیوالی یونیورسٹیوں اور دوسری تعلیم گاہوں کے طرزِ تعلیم ہی نہیں بلکہ طرز تعمیر کا خاکہ بھی اسلامی جامعات کی نقل تھا، 'گب' نے اسی کتاب میں شامل اپنے مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ انگلستان میں چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد جو سب سے پہلی کتاب طبع ہوئی وہ ایک مصری عالم بشر ابن فاتک کی تالیف 'ملفوظات فلاسفہ' کا انگریزی ترجمہ تھی، اس کتاب کو ارل ریورز نے ہسپانوی ترجمے کے واسطے سے The Dictates and Sayings of the Philosophers کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔

اس طرح قائم ہونے والی یورپی درسگاہوں اور ان کے اطراف کی آبادی پر پڑنے والے اثرات نیز عربی سے مغربی زبانوں میں منتقل ہونے والی کتابوں اور پھر صلیبی جنگوں اور ان کے اثرات مابعد نے اسلامی اور عربی علوم وفنون کے یورپ میں داخل اور دخیل ہونے کی راہیں ہموار کیں، ان علوم میں متعدد اسباب کی بنا پر طب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

ای. جی. براؤن نے لکھا ہے کہ "صلیبی جنگیں مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کی محرک کہی جا سکتی ہیں، لیکن یہ محض ایک سیاسی پس منظر ہے، مترجمین کی ایک خاص تعداد حروب صلیبیہ سے پہلے ہی طبی سرمایے کو لاطینی میں منتقل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو چکی تھی"۔ سائنسی علوم کے ممتاز مورخ جارج سارٹن کا بھی خیال یہی ہے کہ صلیبی جنگوں سے صرف نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو اندلس میں مسلم حکومت کا قیام اور یورپ میں اس زمانہ میں قائم ہونے والی طبی درسگاہیں سرزمینِ مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کا اہم ترین سبب معلوم ہوتی ہیں۔

اطالیہ کے شہر سلرنو کے مدرسۂ طبیہ اور ماؤنٹ پیلیر میں واقع طبی درسگاہ کو طب عربی کی

تعلیم و تدریس اور تالیف و ترجمہ کے لیے تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ یورپ کے حکمرانوں کے علاج معالجہ کے لیے جایا کرتے تھے۔

سلرنو کی درسگاہ کا ایک فرد قسطنطین الافریقی بھی تھا جو سب سے پہلے نویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلامی طب کے سرمایہ کو لاطینی میں منتقل کرنے کی طرف متوجہ ہوا، اور اس نے رازی کی الکیمیا، کا ترجمہ لاطینی میں کیا، اگرچہ طبی اصطلاحات کے تراجم میں اس سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، تاہم یہ فخر اس کو حاصل ہے کہ وہ پہلا مستشرق ہے جس نے رازی کو مغرب سے روشناس کرایا، اسی طرح اس کی دلچسپی نے مغرب میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم کی تحریک پیدا کی، سلرنو کے مستشرقین میں ایک اہم شخصیت کریمونا کے جیرارڈ کی ہے، جو سنہ ۱۱۷۵ء میں اٹلی میں پیدا ہوا، اس نے بطلیموس کی ”المجسطی“ اور جالینوس اور بقراط کی کتابوں کے ترجمے کے علاوہ القانون کو لاطینی زبان میں منتقل کر کے اہم خدمت انجام دی، اس ترجمے کے بعد ہی اہل مغرب شیخ الرئیس سے کماحقہ متعارف ہوئے اور ان کے ہاں ایک نئے طبی دور کا آغاز ہوا، براؤن نے ایک اور مستشرق کا ذکر بھی کیا ہے، جو یورپ میں ابن سینا کے افکار کی اشاعت کا سبب بنا، ان کے علاوہ ایک یہودی طبیب فرج بن سالم نے سنہ ۱۲۷۹ء میں رازی کی کتاب الحاوی کا ترجمہ کیا۔

ایڈے لارڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اسلامی علوم اور عربی زبان کی باقاعدہ تحصیل کے بعد انگلستان جا کر متعدد عربی کتابوں کے ترجمے کیے، اس طرح رفتہ رفتہ اسلامی عربی علوم کو یورپ میں فروغ حاصل ہوتا گیا، ہسپانیہ کا شہر طلیطلہ اسلامی علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز تھا، ہسپانیہ میں پیرس کے ایک انگریز طالب علم ڈینیل مارلے نے عربی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے، اس کے سارے ترجمے بارھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں، اسی عہد میں ایک یہودی طبیب ابراہیم نے ڈاکٹر میکس مائن کے اشتراک سے زہراوی کی کتاب کا ترجمہ کیا، الفانسو نیز بوناکو سانے ابن رشد کی کتاب الافعال اور کلیات کا ترجمہ کیا،

اسلامی علوم سے مستشرقین کے شغف کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ بیشتر اہم کتابوں کے ایک سے زیادہ ترجمے کیے گئے۔

تیرھویں صدی میں اسٹیفن نے المجوسی کا ترجمہ وینس سے سنہ ۱۲۹۵ء میں شائع کیا، رابرٹ اور ڈراگن کی کوششوں سے اور نیز دوسرے مترجمین کی محنت اور توجہ سے ۱۵ویں صدی میں کنزی، رازی اور بعض دیگر اطبائے اسلام کی کتابیں بھی لاطینی میں منتقل ہو گئیں اور تسلسل کے ساتھ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپی زبانوں میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم اور ان کی تحقیق کا سلسلہ جاری رہا، عہد بہ عہد مستشرقین کا ذوق تحقیق ترقی کرتا رہا، انھوں نے طبی ذخائر کی تلاش و جستجو شروع کی، نایاب نسخوں کی دریافت اور ان کی نشاندہی اور ان پر تحقیق کے ساتھ ان کی تہذیب و ترتیب ان کے اہم کارناموں کی حیثیت رکھتی ہے، انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی لائبریریوں کے علاوہ شخصی اور ذاتی کتب خانوں میں جا کر بعض اہم نسخوں کا مطالعہ کیا، پروفیسر براؤن نے بعض ایسی طبی کتابوں کے قابل اعتماد نسخوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی نقلیں شخصی کوششوں سے حاصل ہوئیں۔

اطباء کی تاریخ میں قفطی کی تاریخ الحکماء خاص اہمیت رکھتی ہے، ڈاکٹر جولیس لیپرٹ نے خاصے حزم و احتیاط کے ساتھ سنہ ۱۹۰۳ء میں اس کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

پروفیسر براؤن نے الحاوی کے بارہ میں لکھا ہے کہ ”اس کا مکمل ترین نسخہ بوڈلین لائبریری میں ہے، اس کے بعض حصص کے فوٹو میں نے پروفیسر مارگولیتھ کی مہربانی سے حاصل کر لیے ہیں!“

طب اسلامی پر تحقیق کا کام جس کے لیے صرف طبی کتابوں کے ذخیرے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ان وسائل کا اہتمام بھی ضروری تھا جن کی مدد سے ان تصانیف اور کارناموں کی قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو، ان میں قلمی نسخے بھی شامل ہیں، اس سلسلہ کا پہلا کام ان مخطوطات کا تحفظ تھا، (بقیہ

برٹش میوزیم لندن اور اسی طرح برلن کے مشرقی علوم کے کتب خانے اور کتب خانۂ پیرس کے علاوہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے شعبۂ علوم شرقیہ نے انجام دیا۔

تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کتب و مخطوطات کی محققانہ فہرست سازی بھی افادی نوعیت کا ایک اہم کارنامہ ہے، اور انہی فہارس کے ذریعہ خود مشرقی دنیا کو اپنے بعض گہرہائے نایاب کی اطلاع ملی۔

یہ فہرستیں صرف کتابوں کے ناموں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ مصنفین اور مباحثِ کتاب کا ممکن حد تک تعارف بھی ان فہرستوں میں موجود ہے جن سے اہلِ علم ہر دور میں مستفید ہوتے رہے ہیں، پروفیسر براؤن نے بیلیک، بروکلمان کا تذکرہ اپنے لکچرز میں جابجا کیا ہے، ایسی فہرستیں اربابِ ذوق کے لیے بہت اہم ہوتی ہیں، ان فہرستوں اور طبی ذخیروں کی موجودگی اور عربی زبان وادب سے مستشرقین کی دلچسپی نے ان کو اہم خدمات کا موقع عطا کیا۔

پروفیسر براؤن کی صراحت کے مطابق بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد طبی کتابوں کے انگریزی تراجم کے علاوہ ابن الندیم کی الفہرست (سنہ ۳۷۷ھ)، قفطی کی تاریخ الحکما (سنہ ۶۲۴ھ) ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء (سنہ ۶۴۰ھ) اور اسی نوع کی بعض دیگر کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے تھے، اور یہ قابلِ قدر خدمات مستشرقین ہی نے انجام دی تھیں۔

طب عربی کی عمومی خصوصیتوں پر نیوبرگر، پیجل، ویسٹنفلڈ، گیریسن وغیرہ نے قابل قدر کام کیا۔

طب اسلامی پر ناقدانہ بحث ونظر کے سلسلہ میں ڈاکٹر کوننگ اور ڈاکٹر سائمن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان محققین کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اطبائے اسلام کی طبی اصطلاحات کو صحت کے ساتھ درج کیا اور یونانی اصطلاحات سے ان کا مقابلہ وموازنہ بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی میں طب اسلامی سے مستشرقین کے شغف نے جو ارتقائی شکل اختیار کی، اس کے بعض پہلو خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، انیسویں صدی سے ان کی تحقیقات کا دائرہ تراجم اور یونانی کتب سے تقابل سے آگے بڑھ کر سائنٹفک بنیادوں پر قدیم طبی حقائق کی تلاش وجستجو شروع ہوئی، اس کو ہم ان کے علمی ذوق وشعور کی ترقی بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کی اپنی ضرورت بھی۔

فاضل مستشرق مارٹن لیوی نے الکندی پر اپنی فاضلانہ تحقیق پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے "یہ امر مسلّم ہے کہ جدید طب نے خصوصیت کے ساتھ طب اسلامی کے علم دوا سازی اور قرابادینوں سے استفادہ کیا ہے، جدید فن دوا سازی کو اساس وبنیاد طب اسلامی ہی نے فراہم کی۔" یہی خیال در اصل ان کے ذوق تحقیق کے لیے تازیانہ بنا، چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ صدی میں مستشرقین کی توجہ طب اسلامی کے ذخائر کی طرف روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی ہے، انھوں نے طب کی فنی کتب ہی نہیں، بلکہ مسلمان اطبار کی سوانح اور ان کے علمی کمالات کی تفصیلات پر دقیق نظر ڈالی، طب اسلامی کے اولین مآخذ کی تلاش وجستجو کی، مسلمان اطباء کے افکار کے سائنسی عناصر کا تجزیہ کیا، اور دانش حاضر کے سرمایے میں ان کے اثرات کی کارفرمائیوں کا جائزہ بڑے تعمق کے ساتھ لیا، نہایت سلیقہ سے علم اور علماء کی تاریخ کے اہم مآخذ کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا اور ان سارے وسائل وذرائع سے کام لے کر اطبائے اسلام کے کارناموں پر شرح وبسط اور نقد ونظر کے ساتھ روشنی ڈالی۔

یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ اطبائے اسلام کے کارناموں پر مستشرقین کے مضامین ومقالات اور ان کی تصانیف سرسری نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ قدیم تذکرہ نگاروں کی روش سے ہٹ کر تفصیل وتجزیہ اور تعیین مقام ومرتبہ کی کوشش بھی ان کی ممتاز خصوصیت ہے، لیکن ان کے ہمہ گیر ذوقِ تحقیق یا ان کی خدمات کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ اہم ہے، اور وہ ہے اطبائے اسلام کی

تصانیف کو تصحیح و تہذیب کے ساتھ مرتب کر کے پیش کرنا، اور حق یہ ہے کہ اس میدان میں ان کی محنت وکاوش، دقت نظر اور بصیرت کی داد نہ دینا ناانصافی ہے، اس آخر الذکر کارنامے کا منفرد پہلو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کے بعض قیمتی کارنامے ہم تک انہی کوششوں سے پہونچے، اور مستشرقین نے اسلاف کے بعض ایسے علمی کارنامے طشت از بام کیے ہیں جن کی خبر ہمارے بیشتر اہل علم کو اب تک نہیں ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ادارت اور پیش کش ایسے سائنٹفک اصولوں پر ہوتی ہے جن سے تصنیف و مصنف دونوں کی عظمت و افادیت کے سارے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ان کی ادارت و تحقیق کی انفرادیت کے ضمن میں قدماء کی فنی تصانیف کے بھی چند خصائص کا ذکر ضروری ہے، جو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت اہم ہیں، اطبائے اسلام کی فنی تصانیف مثلاً رازی کی الحاوی، ابن سینا کی القانون اور سمرقندی کی القرابادین کی زبان و ہیئت آج کی زبان و ہیئت سے بہت مختلف ہے، وضاحت اور تفصیل جو عصر حاضر کی تحریروں کی خصوصیت ہے وہ بظاہر ان کتابوں میں نظر نہیں آتی، بعض رسائل و کتب پر از اول تا آخر ایک مسلسل پیراگراف کا گمان ہوتا ہے، جو رموز و اوقاف سے خالی ہو، یوں اس قلزم میں سارے گہر موجود ہیں، لیکن قاری کے لیے گہر چینی دشوار ہوتی ہے۔

معنوی خصوصیت میں ابہام اور اصطلاحات کا بکثرت استعمال اور مختصر اشارات خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ کتابوں کے متون بعض ناقلوں کی غفلت کی وجہ سے خلط ملط بھی ہوئے ہیں، ان مشکلات کی موجودگی میں تہ رسی اور غواصی کی مہم بہ آسانی سر نہیں کی جاسکتی تھی، مستشرقین بلا شبہ قابل تبریک ہیں کہ ان دشواریوں کے باوجود انھوں نے طبی کتابوں کے مضامین اور نکات کا ادراک کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

قدماء کے طرز تصنیف اور زبان کی پیچیدگی، اصطلاحات کی کثرت، عبارتوں کی عدم وضاحت کا ذکر براؤن نے بھی کیا ہے، قدیم مصنفین کے نزدیک فنی کتابوں میں تفصیل و تشریح کو غیر علمی اسلوب سمجھا جاتا تھا، حاشیے اور شرحیں اسی لیے وجود میں آئیں، قدیم مصنفین کا خیال تھا کہ کتاب کے مضامین کی ترتیب، حوالے اور مآخذ کی جستجو، اشارات کی مدد سے مباحث کا مکمل ادراک مطالعہ کرنے والے کا کام ہے، مطالعہ کرنے والوں پر ساری تفاصیل کے دروازے کھولنے کی کوشش کو وہ علم اور اہل علم دونوں کی توہین اور حق تلفی سمجھتے تھے، لیکن جدید دنیا میں اخفاء، اغماض اور ابہام کے برخلاف قاری کو ساری سہولتیں بہم پہونچانے کی ذمہ داری مصنف کی سمجھی جاتی ہے، اور جو فنی کتابیں ان اوصاف سے خالی ہوتی ہیں وہ اپنی وسیع افادیت کے باوجود علمی استفادہ میں مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

مستشرقین کی یہ کوشش بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جدید طرز تحریر و تصنیف کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے قدیم طبی سرمایے کو اس قدر پر کشش اور استفادہ کے لیے زیادہ آسان بنا دیا ہے، مشکل مقامات پر توضیحی نوٹ اور کتاب کے مندرجات کی ابجدی فہارس مرتب کر کے انھوں نے کتابوں کی افادیت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

میں اس جگہ طبی اہمیت کے دو [2] کارناموں کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرانا چاہتا ہوں، جو مستشرقین کی مساعی سے ہم تک بڑے مناسب انداز میں پہونچے ہیں، یہ کارنامے الکندی اور سمرقندی کی قرابادین ہیں، جنھیں مارٹن لیوی نے ترتیب نو اور تہذیب نو کے بعد انگریزی ترجمے کے ساتھ شایع کیا۔

تذکرہ نگاروں نے الکندی کی دو سو پینسٹھ (۲۶۵) کتابوں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے بیشتر ناپید بتائی گئی ہیں، بصریات پر اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا صرف لاطینی ترجمہ موجود ہے جس کے

متعلق میکس مایرہوف نے لکھا ہے کہ راجر بیکن اور دوسرے مغربی علمائے بصریات نے اس سے استفادہ کیا ہے، میرے علم کی حد تک کسی مشرقی زبان میں الکندی کی یہ کتاب موجود نہیں، اسی طرح مسلمان تذکرہ نگاروں نے الکندی کی تصانیف میں سے بعض کتابوں کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، ابن ندیم کی الفہرست میں اس کی قرابادین کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ترکی کے کتب خانہ ایا صوفیہ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا، لیکن زمانہ حال تک یہ غیر معروف رہا، ایک ترک عالم کی نشاندہی پر مارٹن لیوی نے اسے اصل مخطوطے کے فوٹو اور اس کے انگریزی ترجمے کے ساتھ مہذب اور منقح کر کے شایع کیا ہے، لیوی نے کتاب میں جو اضافی ابواب تحریر کیے ہیں اُن میں الکندی کی شخصیت اور اس کے علمی اور خاص طور پر طبی کارناموں کا مفصل ذکر کیا ہے. طب اسلامی میں دواسازی اور علم الادویہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، قرابادین میں جن مرکبات کا ذکر ہے اُن کے مفرد اجزاء کے سائنٹفک مترادفات (نباتاتی اور کیمیائی نام) دیے ہیں، طبی دواسازی کی اصطلاحات اور اعمال دواسازی کی تشریح و توضیح کی ہے اور جگہ جگہ تاریخی اور طبی اہمیت کے وضاحتی نوٹ لگائے ہیں، کتابیات کے ضمن میں ان جدید و قدیم مصادر کا ذکر کیا ہے جن سے طبی علوم اور تاریخ طب کے ضمن میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، کتاب کے آخر میں دواؤں کی فرہنگ اور اشاریے لگائے ہیں. اس طرح اس مستشرق نے تاریخ طب اسلامی کا ایک نیا باب اہل تحقیق کے لیے وا کیا ہے، اور ہمارے گم شدہ گوہر کو مجلّٰی کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے.

اس مستشرق نے بالکل اسی انداز پر فخر الدین رازی کے ہم عصر معروف طبیب نجیب الدین سمرقندی کی قرابادین بھی ایڈٹ کر کے شایع کی ہے، لیوی کے ان دونوں کارناموں کا مفصل تذکرہ اس جگہ بے محل ہوگا، یہ دونوں کام میں نے محض نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں.

اس جگہ چند ان مستشرقین کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنھوں نے ایسی ہی بصیرت اور تحقیقی ندرت کے ساتھ خالص سائنٹفک انداز سے اطبائے اسلام کے کارناموں پر مورخانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے.

ان میں اولین نام ایڈورڈ جی براؤن کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی کے نامور پروفیسر اور وسیع النظر مستشرق کی حیثیت سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں رائل کالج آف فزیشنز لندن کی دعوت پر انھوں نے طب اسلامی پر چار فاضلانہ خطبات دیے جو بعد میں کتابی صورت میں Arabian Medicine کے نام سے شایع ہوئے. ۱۹۳۳ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، یہ کتاب بظاہر طب عرب کی تاریخ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف تاریخ نہیں ہے، بلکہ اس میں طب اسلامی کے اساسی تصورات، اس کے ارتقاء اور عالمی تہذیب پر اس کے اثرات، موجودہ طبی سائنس کی ترقی میں اس کے حصے، اکابر اطبائے اسلام کے مقام و مرتبہ، ان کے منفرد طبی انکشافات، طب کی امہات کتب، ان کے مستند نسخے اور ان کی فنی افادیت کی فاضلانہ توضیح و تشریح پر مشتمل ایک بہترین کتاب ہے، اس کتاب میں طب اسلامی کے تصنیفی سرمایے کی طرف اشارہ ہی نہیں بلکہ پوری صراحت اور تحقیق کے ساتھ ہر ایک کے مضامین پر تبصرہ بھی ہے.

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں پروفیسر میکس نیوبرگر کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ میرے لیے بہت مفید ثابت ہوئی اگرچہ اس میں طب عرب کا ذکر کل ۲۶ صفحات میں ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتاب حقایق اور مستند تفصیلات سے پُر ہے".

پروفیسر براؤن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی زبانوں بالخصوص فرانسیسی میں طب اسلامی کی مستند تاریخیں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز اسی دور میں پروفیسر مارگولیتھ جیسے لوگ موجود تھے، جو تشریح قدیم کے سمجھنے میں براؤن کی رہنمائی کرتے تھے، اس طرح میکس نیوبرگر بھی اہم مستشرق سمجھا جاتا ہے، لیکن طب اسلامی کی عظمت کی پر شکوہ عمارت جن علمی اور سائنسی زاویوں سے مورخانہ صداقت کے ساتھ پروفیسر براؤن نے مغربی دنیا کو دکھائی اس نے دیگر مستشرقین کے لیے ایک مستقل مکتبۂ فکر کی صورت اختیار کر لی.

اس کے ٹھیک دس برس کے بعد ۱۹۳۳ء میں Legacy of Islam کے نام سے ایک اور اہم کتاب وجود میں آئی، یہ متعدد فضلاء کی مجلس علمی کی ادارت میں مرتب ہوئی، اس کتاب میں اسلام کی تمدنی، تہذیبی اور علمی میراث اور اس کی عالمی افادیت بالخصوص مغربی فکر و ثقافت پر اس کے اثرات کا ہمہ گیر جائزہ لیا گیا ہے، مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون میں خصوصی مہارت اور شہرت رکھنے والے ماہرین کے مقالات جمع کیے گئے ہیں، اس کتاب میں اسلام کے متعلق جو مختلف فیہ امور آئے ہیں وہ میرا موضوع نہیں ہیں، ان کے بارے میں تنقیدی حوالوں سے آپ حضرات واقف ہیں، اس کتاب کا ایک عنوان اسلامی طب و سائنس بھی ہے، مشہور مستشرق مائر ہوف نے اپنے فاضلانہ مقالے میں جس تاریخی ترتیب سے طب اسلامی کے ارتقاء اور مشرق و مغرب پر اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے وہ ترتیب Arabian Medicine میں بھی نظر نہیں آتی، طبی کتابوں کے یوروپین تراجم اور وہاں کی درسگاہوں کے نصاب میں ان کی شمولیت کی جو تفصیلات اس مستشرق نے پیش کی ہیں ان سے یورپ پر دانش اسلامی کے اثرات کا اندازہ کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بعض مستشرقین نے اطبائے اسلام کے فنی کمالات، تصانیف اور ان کی اہمیت، مستند ماخذ اور دیگر تفصیلات پر جو مقالات پیش کیے ہیں وہ بھی منفرد نوعیت کے کارنامے کہے جا سکتے ہیں، میں اجازت چاہوں گا کہ اس کتاب کے مختلف فیہ مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی گفتگو صرف طب اور سائنسی علوم تک محدود رکھوں، الغرض اس دائرۃ المعارف میں الکندی، رازی، ابن رشد، ابن سینا، فارابی، سمرقندی، زہراوی اور دیگر اطبائے اسلام سے متعلق جو مستند اور مفصل معلومات یکجا کردی گئی ہیں، وہ اگر ایک طرف اکابر کے کمالات کا مرقع ہیں تو دوسری طرف مستشرقین کے اہم کارناموں کی بھی حیثیت رکھتی ہیں، بیسویں صدی کے وسط اول ہی میں ایک ممتاز مستشرق جارج سارٹن جو پہلے ہی سے تاریخ علوم پر متعدد مضامین و مقالات لکھ چکا تھا، اس اہم

کام کی طرف متوجہ ہوا، اس نے دی اسٹڈی آف دی ہسٹری آف سائنس کے عنوان سے تاریخ علم کا دائرۃ المعارف مرتب کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ۱۹۲۷ء میں انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس کے نام سے تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کتاب وجود میں آئی جس میں دانش قدیم و جدید کی تاریخ ہر ممکن تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی۔

جارج سارٹن نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "میرا ایمان ہے کہ عصر حاضر میں علوم و فنون کی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی اساس و بنیاد ماضی میں موجود نہ ہو"۔

یہی خیال اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے ماضی میں انسانی تہذیب و ثقافت کی انتہائی گہرائیوں میں جاکر اساس و بنیاد کی جستجو کی اور اپنے مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا۔

چنانچہ قرون وسطی کی تاریخ علم و ثقافت میں اسلام اور اہل اسلام کے علمی و فکری کارناموں کا کوئی گوشہ اس نے تشنہ نہیں چھوڑا، طب اسلامی نے جس عظیم فلسفۂ سائنس کی بنیاد پر ارتقاء کی منزلیں طے کیں اس پر خصوصیت کے ساتھ اس نے توجہ کی، اس سے نہ صرف ماضی و حال مربوط و ہم رشتہ ہو گئے ہیں بلکہ سارے اکابر کے کارناموں کے منفرد پہلو بھی پوری صراحت کے ساتھ سامنے آ گئے ہیں۔

اس کتاب کی یہ خصوصیت ساری علمی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس میں اسلامی طب و سائنس کا تذکرہ عالمی سائنس کے پس منظر میں کیا گیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلامی طبی دانش کی تاریخ کو اس کے حقیقی جمال و کمال کے ساتھ پیش کر کے سارٹن نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک تازہ کوشش ایڈنبرگ یونیورسٹی کا ایک سلسلۂ کتب "اسلامک سیریز" ہے، اس کی گیارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

مستشرقین کی ان کوششوں کی وجہ سے جہاں اہل مغرب میں اسلامی علوم کے تحقیقی مطالعہ کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے، وہیں ان کی یہ خدمات ہمیں بھی یہ راہ دکھاتی ہیں کہ ہمارے اسلاف نے اپنی ذہنی و علمی کاوشوں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہ سائنسی تحقیقات کے اس دور میں بھی کارآمد مواد اور مزید تحقیق کے لیے مضبوط اساس فراہم کرتا ہے۔

جناب شاہ معین الدین احمد ندویؒ

کی

تاریخ اسلام جلد سوم و چہارم پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی تیسری جلد ۱۹۴۴ء میں شایع ہوئی، جو بنو عباس کے ابتدائی دور کے خلفاء کے حالات اور کارنامے پر مشتمل ہے۔

شروع زمانہ کے زیادہ تر عباسی خلفاء عالی دماغ اور کامیاب حکمراں گذرے ہیں، اس لیے شاہ صاحبؒ نے ان کی بڑی مدح سرائی کی ہے، وہ ابوالعباس عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح (۱۳۲ھ - ۱۳۶ھ، ۷۴۹ء - ۷۵۴ء) سے اس لیے خوش ہیں کہ وہ بڑا حلیم، باوقار، مدبر، فیاض، خلیق اور سیر چشم حکمراں تھا اور ابو جعفر عبداللہ بن محمد الملقب بہ منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ، ۷۵۴ء - ۷۷۴ء) کے گوناگوں اوصاف کی تعریف دل کھول کر کرتے ہیں، جن میں سے کچھ ان کی زبانی سننے کے لائق ہے، لکھتے ہیں کہ وہ اپنے حزم، عقل، علم، اصابت رائے، حسن تدبیر، وقار اور تمکنت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں تھا، اسی نے عباسی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کیا، اس کا سارا وقت امور مملکت پر غور و فکر اور اس کے انتظام میں صرف ہوتا تھا، باغیوں کے لیے وہ نرمی روا نہ رکھتا تھا، مگر عام رعایا کے لیے اصولاً اور عملاً عادل تھا، اس نے رعایا کو اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ معمولی معمولی آدمی اسے علانیہ ٹوک دیتے تھے، اس نے بغداد آباد کر کے اس کو دارالخلافہ بنایا، جو آگے چل کر دنیا کا عظیم الشان شہر بن گیا، اس کے درمیان قصر الخلد

نامی اپنے لیے ایک محل تعمیر کرایا، جو اپنی خوبصورتی، زیب و زینت اور آرایش و زیبایش کے لحاظ سے خلد کا نمونہ تھا، شہر کے ہر قبیلہ اور ہر طبقہ کے محلے الگ الگ اور مختلف چیزوں کے بازار جدا جدا ان کے ناموں سے موسوم تھے، اپنے ولی عہد مہدی کے لیے بغداد کے مشرقی جانب ایک دوسرا محل رصافہ کے نام سے بنوایا، جہاں ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا، اسی کے زمانہ میں امام مالکؒ نے موطا لکھی، امام ابوحنیفہؒ نے فقہ مدون کی، ابن اسحاق نے مغازی مرتب کیے، اس کے درباری منجم ابراہیم فزاری نے علم ہیئت پر کئی کتابیں لکھی تھیں، جن میں ایک تسطیح کرہ پر تھی، منصور نے ابراہیم بن منجم کے لڑکے محمد سے سنسکرت کی کتاب سدھانت کا ترجمہ کرایا، محمد نے ہیئت کی ایک اور کتاب سندھند کبیر کے نام سے تالیف کی، جو مدتوں علمائے ہیئت کا مرجع رہی، جورجیس نے منصور کے لیے طبی کتابوں کے ترجمے کیے، ایک اور درباری طبیب بطریق نے سقراط اور جالینوس کی کتابوں کے ترجمے کیے، منصور کے میر منشی عبداللہ بن مقفع نے جو بڑا نامور ادیب اور فلسفی تھا، ارسطاطالیس کی کتاب قاطیغوریاس، باری آرمیناس اور انولوطیقا اور منطق کی مشہور کتاب ایساغوجی کا ترجمہ کیا، کلیلہ دمنہ کو بھی سب سے پہلے اسی نے عربی کا جامہ پہنایا، فارسی سے پارسی علم الاخلاق کی کتاب کا ترجمہ الادب الکبیر اور الادب الصغیر بھی ابن مقفع کی یادگار ہے، ان کے علاوہ اس نے اور منصور کے دوسرے مترجموں نے ایران کے بانیان مذاہب مانی، دیسان اور مرقون کی کتابوں کے ترجمے کیے۔

شاہ صاحبؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ اپنی فیاضی کے باوصف بسا اوقات پیوند لگے کپڑے بھی پہنتا، اور کہتا کہ مرد آدمی اس حالت میں عز و شرف حاصل کر لیتا ہے کہ اس کی چادر پرانی ہوتی ہے اور اس کی قمیص کی جیب پیوند لگی ہوتی ہے، مگر خزانۂ عامرہ میں اتنی دولت چھوڑ گیا کہ اپنے ولی عہد کو وصیت کر گیا اگر تم کو دس سال تک بھی خراج نہ ملے تو تم کو اخراجات کی تنگی کی شکایت نہ ہوگی۔ (ص ۶۷)

شاہ صاحبؒ نے محمد بن منصور الملقب بہ مہدی کی بھی تعریف کی ہے، لکھتے ہیں کہ نہایت خوش اخلاق

تھا، مزاج میں سختی اور درشتی کا نام تک نہ تھا، اس نے حرمین کی بڑی خدمت کی، خانہ کعبہ کی عمارت میں توسیع کرائی، اس کے چاروں طرف رواق تعمیر کرائے، ان میں سنگ رخام کے ستون لگوائے، کعبہ کے پرانے غلافوں کو اتروا کر اس کی دیواروں پر مشک و عنبر ملوایا، قباطی، خز اور دیبا کے تین غلاف چڑھائے، مسجد نبوی کی بھی آرائش کرائی، شامی رخ پر عمارت میں ستو ہاتھ کا اضافہ کیا، سنگ رخام کے دس نئے ستون لگوائے اور پوری عمارت کو نقش و نگار سے آراستہ کرایا، عقائد میں بہت پختہ اور مذہب کے معاملہ میں بڑا متشدد تھا، ملحدوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کراتا، ان کی کتابیں جلوادیں، الحاد اور زندقہ کے تدارک کے لیے حکمار کو مناظرانہ کتابوں کی تالیف کا حکم دیا، جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی، اس فن کی ایجاد کا سہرا اسی کے سر ہے، نماز باجماعت کا بڑا اہتمام کرتا، اس کا دل خشیتِ الٰہی سے لبریز تھا، ایک بار ہوا کا سخت طوفان آیا تو رخساروں کو فرشِ خاک پر رکھ کر دعا کی کہ خدایا! امتِ محمدیہ کی حفاظت کر، خدایا! ہمارے دشمنوں کو ہماری تباہی پر ہنسنے کا موقع نہ دے، اگر میرے گناہوں کی پاداش میں تو نے عالم کو پکڑا ہے تو یہ پیشانی تیرے حضور میں حاضر ہے۔ اس کے باپ منصور نے جس قدر مال زیادتی سے حاصل کیا تھا، سب واپس کر دیا، اور اپنے اعزہ و اقربا اور دوسرے معززین میں دولت تقسیم کر دی، ایک ایک شاعر کو اس نے پچاس پچاس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں، آخر میں اس کا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔

آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ان خوبیوں کے ساتھ وہ بڑا عیش پرست اور رنگین مزاج تھا، اس کا محل حسین عورتوں کا جمالستان تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس عیش پرستی کے باوجود امورِ مملکت سے کبھی غافل نہ ہوا، اس کے لیے ایوان عیش کی رنگینیاں اور میدان کارزار کی ہولناکیاں دونوں یکساں دلچسپ تھیں، وہ عیش بھی کرتا تھا اور امور مملکت پر بھی نگاہ رکھتا تھا اور میدانِ جنگ میں بھی نکلتا تھا، اسی لیے اس کا زمانہ ہر حیثیت سے کامیاب رہا۔

موسیٰ بن مہدی الملقب بہ ہادی نے ایک سال تین مہینے حکومت کی، ۲۶ سال کی عمر میں وفات پاگیا، شاہ صاحبؒ نے اس کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ باپ ہی کی طرح جملہ اوصافِ جہانبانی سے متصف تھا، مذہب میں متشدد اور ملحدوں اور زندیقوں کا سخت دشمن تھا، ذات پاک نبویؐ کے متعلق کوئی گستاخی سنتا تو سر قلم کرا دیتا۔

ہارون رشید کا عہد دولت عباسیہ کا اوج شباب تھا، اس کی تفصیل لکھنے میں شاہ صاحبؒ کا قلم بہت رواں دواں ہوا، لکھتے ہیں: اس کے زمانہ میں دولت عباسیہ علمی، تمدنی اور سیاسی حیثیت سے اوجِ کمال پر پہونچ گئی، بیت الحکمت اسی کے زمانہ میں قائم ہوا، جس سے علوم و فنون کا دروازہ کھلا، اس کے دربار میں جتنے علما، شعرا، فقہا، قضاۃ، کاتب، ندیم اور گویے جمع ہوئے کسی خلیفہ کے دربار میں نہ تھے، خود بھی بڑا اہل فضل، شاعر، اخبار و آثار کا راوی اور صحیح المذاق تھا، خواص اور عوام سب کے دلوں میں اس کی ہیبت تھی، اس کے پاس جیسا نورتن جمع تھا وہ کسی فرماں روا کو میسر نہیں آیا، اس کے وزیر برامکہ تھے، اس کے قاضی امام ابو یوسف تھے، اس کا درباری شاعر مروان بن ابی حفصہ جیسا قادر الکلام تھا، جو اپنے زمانہ کا جریر شمار کیا جاتا تھا، اس کا ندیم عباس بن محمد تھا، اس کا حاجب فضل بن عباس جیسا مرجع خلائق تھا، اس کا مغنی ابراہیم موصلی جیسا یگانۂ روزگار تھا، اس کی بیوی ام جعفر (زبیدہ) جیسی مخیر خاتون تھی جس نے ملکی اور رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے، اس کی پرشکوہ زندگی میں رنگینی اور عیش پرستی بھی تھی لیکن اس کے ساتھ وہ بڑا دیندار اور پابند شریعت بھی تھا، روزانہ سو رکعت نفلیں پڑھتا، ایک ہزار درہم خیرات کرتا، اکثر حج کو جاتا، حج میں بڑے الحاح وزاری سے دعائیں مانگتا، جہاد کا شوق اور شہادت کا بڑا ولولہ رکھتا، اسی کے ساتھ اس کی سلطنت نہایت مضبوط، ملک شاد و آباد اور خزانہ معمور رہا، اس کی سلطنت کا رقبہ بڑا وسیع تھا، دنیا کے بڑے حصہ سے خراج آتا تھا، والی مصر اس کا ایک عامل تھا۔

مامون الرشید کے فضل و کمال، اس کے عہد کی علمی ترقیاں، رعایا کی خبر گیری، عدل پروری، حلم، عفو،

تواضع و بے تکلفی، فیاضی اور اس کے مذہبی عقائد وغیرہ کے دکھانے میں شاہ صاحبؒ کے قلم میں بڑی روانی پیدا ہو گئی ہے، انھوں نے اس کے عہد کی بغاوتوں، شورشوں اور فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد اس کے اوصاف اور محاسن بیان کیے ہیں، اس کو پڑھنے کے بعد یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ وہ تدبیر، سیاست، عقل، دانش، فہم، ذہانت، فضل، کمال، عدل، انصاف، شجاعت، شہامت، فیاضی، دریادلی، حلم، عفو، سادگی، تواضع جملہ اوصاف میں کامل تھا، وہ اپنی بلند اور شریف ہمت اور اپنے نفس فاضل کی قوت سے علوم کو ان کے خزانوں اور معدنوں سے نکالنے پر آمادہ ہوا، اس نے ارسطا طالیس، سقراط، جالینوس اور اقلیدس وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور ان کے پڑھنے کا شوق دلایا، اس کے عہد میں شام، عراق اور فارس کے مترجمین بغداد میں جمع ہو گئے تھے جن میں نسطوری، یعقوبی، صابی، مجوسی، رومی اور برہمن سب ہی تھے، یہ سب یونانی، فارسی، سریانی، سنسکرت، نبطی، لاطینی وغیرہ کے ترجمے کرتے تھے، بغداد اس وقت علم و فن کا مرکز بن گیا تھا، علم و فن کی خدمت میں اس کا زمانہ ہارون کے عہد سے بڑھ گیا تھا، اس نے عدل کے قیام اور جور و ظلم کے انسداد میں بڑا اہتمام کر رکھا تھا، اتوار کے دن صبح سے ظہر تک رعایا کی شکایتیں سننے کے لیے خود بیٹھتا، وہ حد سے زیادہ حلیم و بردبار تھا، اپنے دشمنوں تک سے عفو و درگذر سے کام لیتا، نوکروں کی باتیں سن کر چشم پوشی کر جاتا تھا، اس میں خودی اور تمکنت نام کو نہ تھی، اس کے نزدیک دولت کا مصرف یہی تھا کہ اس کو لٹایا جائے، شعراء، ادباء، اہل کمال اور حاجت مند اس کی فیاضیوں سے مالا مال تھے، اس کا اصولِ زندگی یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے اہل حاجت کی ضروریات پوری کی جائیں، اس کی فیاضی کے لیے اس کے خزانہ کی آمدنی ناکافی ہوئی۔ گذشتہ دور میں علویوں پر حکومت کے عہدوں کے دروازے بند تھے، اس نے انھیں بڑے بڑے عہدوں پر یہ کہکر مقرر کیا کہ وہ گذشتہ خلفاء کی فروگذاشتوں کی تلافی کر رہا ہے، عقائد میں مجموعۂ اضداد تھا، فلسفہ کے مطالعہ اور غیر قوموں کے علماء کی صحبت کے اثر سے وہ خلق قرآن کا قائل تھا، اور جن علماء نے اس کی مخالفت کی ان کو سخت سزائیں دیں، اس کے بعض عقائد شیعی تھے، بعض

اہل سنت کے اور بعض فلسفیانہ، وہ خود کہتا تھا کہ معاویہ کی قوت عمرو بن العاص کے بل پر تھی، عبد الملک کا سہارا حجاج تھا، لیکن میری قوت و عظمت خود میری ذات سے ہے، اسی لیے مورخین اس کو عباسی سلسلہ کا درمیانی گوہر کہتے ہیں، افتتاحی سفاح، اختتامی معتضد اور درمیانی مامون، اس کی عالی ظرفی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ صاحب اولاد تھا، لیکن اپنی اولاد میں سے کسی کو حکومت کا اہل نہیں سمجھا، اس لیے اپنے سوتیلے بھائی معتصم کو اپنے مرض الموت میں ولی عہد بنا کر اس کا اعلان کر دیا، شاہ صاحبؒ نے معتصم کے بھی بہت سے اوصاف کی تعریف کی ہے، لکھا ہے کہ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہ تھا، لیکن اس میں جسمانی قوت غیر معمولی تھی، توانا سے توانا آدمی کا بازو دبا دیتا تھا تو ہڈیاں چٹخ جاتی تھیں، اسی لیے اس کو بزم کے بجائے رزم سے دلچسپی تھی، بڑی بڑی مہموں میں خود نکلتا تھا۔ اس کو صرف دو چیزوں کا ذوق تھا، حکومت کی شان و شکوہ اور میدان کارزار کے مناظر، اس کا روپیہ ان ہی چیزوں میں صرف ہوتا، اس کا سب سے بڑا بجٹ جنگی تھا، اس نے اپنی آٹھ سالہ مدت خلافت میں تمام اندرونی و بیرونی طاقتوں کا قلع قمع کر دیا، جس طاقت نے سر اٹھایا، کچل کر رکھ دیا، اس نے آٹھ ملک فتح کیے اور آٹھ دشمنوں کو مغلوب کیا، اس کے زمانہ میں آٹھ فرماں روا اسیر ہوئے، جس کی مثال کسی خلیفہ کے زمانہ میں نہیں ملتی، مگر شاہ صاحبؒ کی رائے میں اس کی بہت بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے ایرانیوں کا زور توڑنے کے لیے ترکوں کو آگے بڑھانے کی پالیسی اختیار کی، جس طرح ہارون اور مامون کے زمانہ میں ایرانیوں کا عروج تھا، اسی طرح اس کے زمانہ میں ترکوں کا ستارہ چمکا، اس سے حکومت کی شان تو ضرور بڑھ گئی اور فتوحات کو بھی فائدہ پہونچا، لیکن آیندہ چل کر جب حکومت کمزور پڑی تو ترکوں کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ خلفاء کا وقار جاتا رہا اور وہ ان کے ہاتھوں میں تماشا بن کر رہ گئے، ترک جسے چاہتے تھے تخت پر قائم رکھتے تھے، اور جسے چاہتے اتار دیتے۔

شاہ صاحبؒ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ عباسی دور کے عروج کا زمانہ معتصم باللہ تک رہا، اس کی

مدت بانوے ۹۲ سال تھی، اس کے بعد چار سو ۴۰۰ برس سے کچھ زیادہ تک ان کی حکومت ضرور رہی مگر ان پر ترک اور آل بویہ حاوی رہے، معتصم کے بعد دو سو ۲۰۰ سال تک گویا ترکوں کی حکومت تھی، بقیہ دو سو ۲۰۰ سال آل بویہ مسلط رہے، ترکوں کے اقتدار کے زمانہ میں خلفاء کے بہت کچھ اختیارات باقی تھے، حکومت کا نظام ان ہی کے نام اور حکم سے چلتا تھا، اس دور میں بعض ایسے اولوالعزم اور حوصلہ مند خلفاء بھی پیدا ہوئے جنھوں نے ترکوں کی قوت کو توڑنے اور ان کا اقتدار گھٹانے کی کوشش کی اور اس میں ان کو عارضی کامیابی بھی ہوئی، لیکن مکتفی باللہ المتوفی ۳۳۳ھ کے عہد میں جب بنی بویہ نے ترکوں کی جگہ لی تو انھوں نے گو خلفاء کا ظاہری احترام قائم رکھا لیکن عملاً ان کو عضو معطل بنادیا، حکومت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور خلفاء کا وظیفہ مقرر کر دیا اور ان کا محض نام باقی رہ گیا۔

اس خاندان کے فرماں روا راضی باللہ کے زمانہ میں دولت عباسیہ کے پرزے اڑ گئے، مغرب میں شمالی افریقہ کا علاقہ عرصہ سے عباسیوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، یہاں علویوں کی حکومت قائم تھی، مصر و شام کے ایک حصہ میں محمد بن طغج کی نیم آزاد حکومت قائم تھی، مشرقی صوبوں میں خود سر امراء نے آزاد اور نیم آزاد حکومتیں قائم کر لی تھیں، ماوراء النہر میں سامانی حکمراں تھے، موصل، دیار ربیعہ اور دیار مضر میں آل حمدان کی حکومت تھی، طبرستان اور جرجان میں دیلمی حکومت قائم ہو چکی تھی، فارس کا علاقہ اور خوزستان کا ایک حصہ عماد الدولہ کے قبضہ میں تھا، اس کے بڑے حصہ پر ابو عبداللہ یزیدی مسلط تھا، عراق عجم کے لیے رکن الدولہ اور وشمگیر میں رسا کشی تھی، کرمان ابو علی محمد بن الیاس کے تصرف میں تھا، بحرین اور یمامہ پر قرامطہ مسلط تھے، بصرہ اور واسط ابن رائق کے پاس تھے، غرض عراق سے لے کر سندھ تک دولت عباسیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی راضی باللہ محض زرنگار تخت پر بیٹھ کر اس ادبار کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

تاریخ اسلام جلد چہارم

اسی قسم کی تفصیلات کے ساتھ شاہ صاحب کی تاریخ اسلام کی تیسری جلد مقتدر کے کچھ حالات کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اس کی چوتھی جلد ۱۹۴۵ء میں شایع ہوئی، پہلے ذکر آیا ہے کہ اس کی پہلی جلد

۱۹۳۹ء میں نکلی تھی، جب ان کی آخری جلد ۱۹۴۵ء میں شایع ہوئی تو اس سے ظاہر ہے کہ اس سلسلہ کی تکمیل چھ ۶ سال میں ہوئی، مگر ظاہر ہے کہ پہلی جلد لکھنے میں کم از کم ایک سال صرف ہوا ہوگا، اس طرح شاہ صاحبؒ نے ان چار جلدوں کے لکھنے میں تقریباً سات سال سے زیادہ صرف کیے۔

اس چوتھی جلد میں خلافت بغداد کی ۳۱۳ سال کی تاریخ ہے، آخر میں مصر میں جو خلافت عباسیہ قائم ہوئی اس کی بھی تاریخ ۶۵۹ھ/۱۲۶۲ء سے ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء تک کی ہے، مگر اس کے لکھنے میں شاہ صاحبؒ کا قلم زیادہ رواں نہیں ہو سکا ہے، صرف سنین وار ان کے مختصر حالات قلمبند کر دیے گئے ہیں۔

بغداد کے خلفاء کی تاریخ اس جلد میں مستکفی باللہ (۳۳۳ھ/۹۴۵ء) سے مستعصم باللہ (۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء) تک ہے، اس میں زیادہ تر شورشوں، بغاوتوں، اقتدار کی خاطر زور آزمائیوں کا ذکر ہے، خلفاء کی معزولی اور مقتدر شخصیتوں کے قتل کی ہولناک تفصیلات بھی ہیں، ان واقعات کے لکھنے میں شاہ صاحبؒ کی تحریروں میں درد ناکی پیدا ہو گئی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلافات سے حکومت اور مملکت کو جو نقصانات پہونچے رہے ان کا بھی ذکر ہے، اور دکھ بھری بات تو یہ ہے کہ بعض عباسی حکمرانوں کے رعب اور دبدبہ سے رومن امپائر کے فرماں روا بھی کانپ جاتے تھے، اور جب تک اس خاندان کی حکومت میں مرکزیت رہی اور سارے علاقے اس کے سامنے جھکتے رہے تو دنیا بھی اس کے آگے جھکتی رہی، مگر جب یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تو راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی، باہمی نفاق کی وجہ سے اتنی حکومتیں علحدہ علحدہ قائم ہو گئیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے، کچھ کے نام یہ ہیں: صفاریہ، اغلبیہ، طاہریہ، سامانیہ، طولونیہ، دیلمیہ، شاہنیہ، حسینیہ، غزنویہ، سلجوقیہ، اتابکیہ، ایوبیہ وغیرہ: اس علحدگی پسندی سے وہ خود برباد ہو کر رہیں، اور ایک عظیم الشان حکومت کو برباد کر گئیں، مگر یہ درس دے گئی ہیں کہ اتحاد اور یگانگت ہو تو مسلمان دنیا کو اپنے سامنے خم کر سکتے ہیں لیکن باہمی نفاق اور منافقت ہو تو خون کی ہولی کھیل کر ساری دنیا کے سامنے رسوا ہو سکتے ہیں۔

جب مستعصم باللہ کے زمانہ میں اس کے شیعہ وزیر ابن علقمی کی بے وفائی اور غداری سے تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کرکے عباسی حکومت کو ختم کیا تو شاہ صاحبؒ اس طرح نوحہ کناں ہوتے ہیں:

"وحشی تاتاریوں نے بغداد جیسے عظیم الشان شہر کو ویران کر ڈالا، ابن خلدون کا بیان ہے کہ صرف شاہی محلات سے انھوں نے جتنی دولت اور جس قدر ساز و سامان لوٹا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، عباسی کتب خانہ کی تمام کتابوں کو جو صدیوں کا سرمایہ تھیں، دجلہ میں ڈبو دیا، مقتولین کی تعداد کا اندازہ سولہ لاکھ تھا۔"

عباسیوں کے زمانہ کی تاریخ کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان کی سلطنت سے کٹ کر سلجوقیوں، اتابکیوں اور ایوبیوں کی جو حکومتیں قائم ہوئیں تو ان کے بعض حکمرانوں کی سیرت و کردار پر مسلمانوں کو اب تک فخر ہے، اور ان کے کارناموں کو پڑھ کر ان کا سر ابھی تک اونچا ہوتا ہے، سلجوقی حکمراں طغرل کے بارہ میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"طغرل کے کمالات اور اوصاف جہانبانی اس کی زندگی کے واقعات سے ظاہر ہیں، اس نے اپنی قوت بازو سے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی، مخالف طاقتوں کو مغلوب کرکے اس کو اس قدر مضبوط کر گیا کہ اس کے جانشینوں نے اس کی بنیاد پر سلجوقی حکومت کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا، خلافت بغداد کو دیالمہ کے پنجے سے آزاد کرایا...... وہ ایک راسخ العقیدہ اور دیندار مسلمان اور پاکباز و متقی فرماں روا تھا، نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتا تھا، تہجد کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، ہر جمعہ اور دوشنبہ کو روزہ رکھتا تھا، صدقات و خیرات کرتا تھا، مسجدوں کے بنوانے سے شغف رکھتا تھا، کہا کرتا تھا کہ مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عمارت بنواؤں اور اس کے پہلو میں مسجد نہ ہو۔"

پھر اسی خاندان کے حکمراں الپ ارسلان کے متعلق رقمطراز ہیں:

"ابن اثیر اس کے ذکر میں لکھتا ہے کہ وہ فیاض، عادل، عاقل اور فرزانہ تھا، اس کی حکومت کے

حدود بہت وسیع ہوگئے تھے، ایک عالم اس کے سامنے جھک گیا تھا، اور اس کو سلطان العالم بالکل بجا کہا جاتا ہے،...... اس کے حدود حکومت میں جرائم مفقود ہوگئے تھے...... بڑے سے بڑا عہدہ دار ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کے مال کی جانب نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا..... وہ طبعاً نہایت رقیق القلب اور غریب پرور تھا، غربا پر بکثرت خیرات کرتا تھا، رمضان میں پندرہ ہزار اشرفیاں تقسیم کرتا تھا، خاص پایہ تخت کے محتاجوں کے لیے مطبخ شاہی میں روزانہ پچاس بکرے ذبح ہوتے تھے، علم و فن کا قدردان اور سرپرست تھا، بغداد میں بصرف کثیر ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، جو مدرسہ نظامیہ کے علاوہ تھا۔"

ملک شاہ کے اوصاف کی مرقع آرائی جس طرح کی ہے اس کے جستہ جستہ اقتباسات یہ ہیں:

"ملک شاہ اپنے اوصاف، خصوصیات، ملک گیری اور ملک داری میں نہ صرف سلجوقی سلاطین، بلکہ دنیا کے ممتاز ترین حکمرانوں میں تھا، وہ سلطان عادل کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، سلجوقی سلاطین میں اس کا زمانہ ہار کے درمیانی بڑے موتی کی طرح ممتاز و نمایاں تھا، اس کے آغاز اور انجام دونوں میں ایک تناسب تھا، جس اقلیم کا رخ کیا اس کو تسخیر کیا اور جس دشمن کا قصد کیا اسے زیر کیا، راوندی کا بیان ہے کہ ملک شاہ کے اسلاف نے جہانگیری کی اور اس نے جہانداری، انھوں نے حکومت کا پودا نصب کیا اس نے پھل کھایا، انھوں نے تخت سلطنت بچھایا، اس کے زمانہ میں برگ و بار لایا، اس کے خوف سے سلجوقی فوجوں کو ظلم و زیادتی کی جرأت نہیں ہوئی، عوام بے خوف و خطر اس کی فوج میں گھومتے پھرتے تھے، اپنے حدود سلطنت میں ہر قسم کے تجارتی ٹیکس موقوف کر دیے، سارے ممالک محروسہ میں سڑکیں نکلوائیں، گذرگاہوں پر سرائیں اور دریاؤں میں پل بنوائے، مکہ معظمہ کے راستہ میں جا بجا پانی کے ذخیرے کے لیے حوض و تالاب بنوائے، خود بھی صاحب علم اور اس سے زیادہ علم و فن اہل علم اور ارباب کمال کا قدردان تھا، اس نے سلجوقی حکومت کے جغرافیہ پر خود ایک رسالہ لکھا، اس کے دور کے علمی خدمات کے

سلسلہ میں سب سے اہم اور قابل ذکر زیچ ملک شاہی ہے، جسے اس کے نام پر حکیم عمر خیام نے ترتیب دیا تھا، عمارتوں کی تعمیر کا بھی بڑا ذوق رکھتا تھا وغیرہ وغیرہ"

ملک شاہ کے وزیر نظام الملک کے کارنامے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ جس پایہ کا وزیر تھا، تاریخ اسلام میں برامکہ کے علاوہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی، اس نے تیس ۳۰ سال تک اس شان و شکوہ کی وزارت کی اور ایسے کارنامے انجام دیے کہ اس کے سامنے برامکہ کی داستانیں ماند پڑ گئیں، ملک شاہی دور کی ساری درخشانی جو سلجوقیوں کا دور زریں شمار کیا جاتا ہے، نظام الملک ہی کی ضو پاشیوں کا نتیجہ تھی۔

عماد الدین زنگی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ صلیبی جنگ کے مقدس جہاد کا ہیرو اور اس قافلہ کا پہلا قافلہ سالار عماد الدین ہی تھا، اس پہلو سے قطع نظر وہ ذاتی اوصاف و محامد اور جہانبانی و حکمرانی کے لحاظ سے بھی ایک بہترین فرمانروا تھا، شجاعت، شہامت، تدبر، سیاست، عدل، انصاف اور دینداری تمام اوصاف میں کامل تھا۔

نور الدین زنگی کے اوصاف بیان کرنے میں ان کا قلم بالکل نہیں تھکا، اس کی تعریف میں ابن اثیر کا ایک طویل اقتباس دینے سے پہلے وہ خود لکھتے ہیں کہ اس نے اسلامی حکومت کا جو نمونہ پیش کیا اس کی نظیر خلفائے راشدین کے سوا تاریخ اسلام میں مشکل سے مل سکتی ہے اس کی ساری زندگی میدان جہاد میں گذری، اور اس نے صلیبی جنگ میں جو معرکے سر کیے اس کی تفصیل شاہ صاحبؒ نے کچھ ایسے دلولہ انگیز طریقہ سے لکھی ہے کہ اس کو پڑھنے میں لطف حاصل ہوگا۔

پھر صلیبی جنگ میں صلاح الدین ایوبی کی نیزہ آزمائی، پامردی اور معرکہ آرائی کو کچھ ایسے انداز میں لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خود جھوم رہے ہیں اور اپنی کتاب کے پڑھنے والوں کو جھومنے کی دعوت دے رہے ہیں، صلیبی جنگ کی تفصیلات کو سمیٹنا آسان نہ تھا، لیکن شاہ صاحبؒ نے ان کو چند اوراق میں سمیٹا ہے، انھوں نے اس ایجاز میں اطناب کا رنگ پیدا کر دیا ہے، جس کو پڑھ کر دینی حمیت اور ایمانی حرارت بروئے کار

آئے بغیر نہیں رہ سکتی، انھوں نے اس مجاہد اعظم کے اخلاق و سیرت کی تصویر اس کے رفیق خلوت و جلوت قاضی بہاء الدین ابن شداد کے حوالہ سے اپنی کتاب کے بیس ۲۰ صفحوں میں کھینچی ہے، وہ اس لائق ہے کہ اس کو ایک علحدہ چھوٹے سے رسالہ میں شایع کر کے ہر مسلمان کو پڑھنے کے لیے دیا جائے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ ایک مسلمان فرماں روا نے اپنی جہانگیری، جہانبانی اور جہانداری کا کیسا اعلیٰ نمونہ پیش کیے، خود شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ صلاح الدین تنہا شمشیر زن مجاہد ہی نہ تھا، بلکہ فضائل اخلاق کا بھی مکمل نمونہ تھا، اس نے شعائر دینی کا جو احترام کیا، یا اپنی عدل پروری، شجاعت، رواداری، حلم، بردباری، مہمان نوازی، رعایا پروری کی جو مثالیں پیش کیں، ان سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت کی تاریخ روشن ہوئی، ان تمام چیزوں کو قلمبند کرنے میں شاہ صاحبؒ نے بڑی خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے جہاں ان فرماں رواؤں کی تعریف و تحسین کر کے اپنے ناظرین کو فخر کے ساتھ سر اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے، وہاں عباسیوں کے پورے دور میں جو شورشیں، بغاوتیں اور اقتدار کی خاطر جو باہمی آویزشیں ہوتی رہیں اور اس سلسلہ میں جو خوں ریزی اور قتل ہوتے رہے، ان کی تفصیل بھی لکھی ہے، انھوں نے متوکل علی اللہ اور مقتدر باللہ کے قتل اور معتز باللہ، مہتدی باللہ اور قاہر باللہ کی معزولی کا ذکر بہت دکھ سے کیا ہے، اسی طرح اپنی چوتھی جلد میں مستکفی باللہ، مطیع للہ، طائع للہ، راشد باللہ کی معزولی اور مستعین باللہ، مسترشد باللہ، راشد باللہ اور مستعصم باللہ کے قتل پر ان کا قلم اور سوگوار ہو گیا ہے، پھر مقتدر شخصیتوں کا جو قتل ہوا اس کی فہرست شاہ صاحبؒ کی اس کتاب سے تیار کی جائے تو وہ بہت لمبی ہو جائے گی، اس طرح ان کی تاریخ کی چاروں جلدیں بڑی معروضیت اور حقیقت پسندی سے لکھی گئی ہیں، جن میں مسلمانوں کے لیے عبرت اور بصیرت حاصل کرنے کا پورا سامان موجود ہے، حکمرانی اور جہانبانی کے سلسلہ میں دوسری قوموں میں بھی معزولی، قتل، سفاکی، غارتگری اور خوں ریزی کی مثالیں ملتی ہیں، مگر مسلمان تو خیر امت قرار دیے گئے ہیں، ان کے کردار کا

نمونہ ہر شعبۂ حیات کے ساتھ سیاسی زندگی میں اعلیٰ ہونا چاہیے تھا، وہ تو قیصر و کسریٰ کی روایات کو ختم کرکے اخلاق اور انسانیت کو سنوارنے کے لیے دنیا میں مامور کیے گئے تھے، مگر انھوں نے اپنے بشری تقاضوں کی بنا پر اپنی حکمرانی میں وہی سب کچھ کیا جو اور قومیں کرتی رہیں تو اس کے لیے کوئی حسن تاویل قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

شاہ صاحبؒ کی تاریخ اسلام کی چوتھی جلد میں ایک خاص چیز کی کمی رہ گئی ہے، انھوں نے اس کی دوسری جلد میں بنو امیہ کے زوال کے اسباب لکھے ہیں، اس کی آخری جلد میں بنو عباس کے زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے تھی، مگر معلوم نہیں کیوں اس پہلو پر تفصیلی بحث نہیں کر سکے، حالانکہ بنو عباس پر جو دو جلدیں لکھی گئی ہیں ان کے اندر کے واقعات سے زوال کے اسباب کا تجزیہ آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔

دکھ بھری بات تو یہ ہے کہ بنو عباس کے حکمرانوں میں تھوڑی سی بھی کمزوری پیدا ہو جاتی تو پھر دور دراز کے علاقوں میں خود مختاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا، پہلے ذکر آیا ہے کہ ادریسیوں، طولونیوں، طاہریوں، صفاریوں، سامانیوں وغیرہ نے اپنی اپنی حکومتیں بنو عباس کی مملکت سے کٹ کر ضرور بنائیں، لیکن وہ ان کو قائم نہ رکھ سکے، اس نفاق اور افتراق سے ان کو بنو عباس اور مسلمانوں کے سواد اعظم کو نقصان پہونچتا رہا، کلام پاک کے ذریعہ سے مسلمانوں کو یہ پیام دیا گیا تھا کہ وہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں، ورنہ وہ بزدل ہو جائیں گے اور ان کی ہوا خیزی ہو جائے گی (انفال آیت ۴۷۔ ۴۵) پھر رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، یہ کہہ کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، لیکن بنو عباس اور ان کے عہد کے لوگوں نے ان تعلیمات پر عمل نہیں کیا، زیادہ تر مذہبی گروہ بندی، فکری انارکی، ذاتی مفاد پرستی، بدعہدی، پیمان شکنی، اور علاقائی تعصب کے جذبات سے مغلوب رہے، جس سے ان کی ہوا خیزی ایسی ہوتی رہی کہ ایک منفعت اور ایک نقصان کے احساس رکھتے، ایک ہی دین، ایک حرم پاک، ایک اللہ اور ایک قرآن کے تابع

ہونے کے باوجود ایک نہ ہو سکے، ان میں وصال مصطفوی کے بجائے افتراق بولہبی پیدا ہوتا رہا اس لیے پنپ نہ سکے، عباسی دور کے آخری فرماں رواؤں میں ظاہر باللہ (۶۲۲-۲۳ھ / ۱۲۲۵-۲۶ء) نے اپنے عمال کو یہ فرمان بھیج کر تنبیہ کی تھی کہ ان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے ملک کی بربادی، رعایا کی خانماں خرابی، شریعت کی اہانت ہوئی، انھوں نے اپنے ذاتی اغراض کی خاطر باطل کا اظہار کیا، تحصیل محاصل کی ظالمانہ صورتوں پر استیفار اور استدراک کے خوشنما الفاظ سے پردہ ڈالا، اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے باطل کو حق سے خلط ملط کیا، وہ خدا سے نہیں ڈرے، انصاف کے بجائے ظلم کیا، پھر اس نے آخر میں لکھا کہ اگر تم خلفاء اللہ فی الارض کے عہدہ داروں اور اس کی مخلوق کے امینوں کے طریقہ پر چلو گے تو فبہا، ورنہ برباد ہو جاؤ گے، یہ تنبیہ صحیح تھی، مملکت اس لیے برباد ہوئی کہ اس کے حکمراں اور عہدہ دار صحیح راستہ پر نہیں چلے۔

قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کو یہ مشورے دیے تھے کہ کوئی عمارت جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو، قائم نہیں رہ سکتی، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے بنانے والے پر گرا دیتا ہے، تقویٰ اگر خدا کے لیے اختیار کیا جائے تو خدا بھی تقویٰ اختیار کرنے والوں کی حفاظت کرتا ہے، بادشاہوں کو اپنے خدا کے بارہ میں وہی چیز پیش کرنی ہوگی جو چرواہا اپنے مالک کی خدمت میں پیش کرتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے خوش قسمت وہ راعی ہوگا جس کے ذریعہ اس کی رعایا کو خوش بختی حاصل ہوئی ہو، راعی کی کج روی سے رعایا بھی سیدھی راہ سے ہٹ جاتی ہے، ایک حکمراں کو خواہش نفس کی تعمیل اور غصہ کی بنا پر مواخذہ کرنے سے پرہیز کرتے رہنا چاہیے، اگر اس کے سامنے ایسے دو امور آئیں جن میں ایک میں دنیا کا بھلا ہو اور دوسرے میں آخرت کا، تو آخرت والے امر کو اختیار کرنا بہتر ہے، دنیا فانی اور آخرت پائیدار ہے، خدا کے معاملہ میں قریب و بعید سب کو برابر قرار دینا چاہیے، اس بارہ میں ملامت کا خوف سد راہ نہ ہو، خدا کا خوف دل سے ہو، زبان سے نہ ہو، خراج وصول کرنے والے عمال صالح، پاکدامن، فقیہ اور عالم ہوں، وہ ظالم نہ ہوں، خراج ادا کرنے والوں کی تحقیر و تذلیل نہ کریں، وہ

مسلمانوں کے ساتھ نرمی، نافرمانوں کے ساتھ سختی، ذمیوں کے ساتھ عدل، مظلوم کے ساتھ انصاف کریں، ظالموں کے لیے درشت ہوں، اور عام لوگوں سے درگذر اختیار کریں، جب کسی عامل کا ظلم یا حرام خوری یا بدکرداری ثابت ہوجائے تو اس کو اس کے عہدہ پر برقرار رکھنا، اس سے مدد لینا، رعایا کے کسی معاملہ میں اس کو مختار بنانا اور حکومت کے معاملات میں شریک کرنا حرام ہے، اس کو ایسی عبرتناک سزا دینی چاہیے کہ دوسروں کو سبق ہو، خبر رساں رعایا اور حکام کی کوئی خبر نہ چھپانے پائیں، اور نہ اس میں اپنی جانب سے کچھ اضافہ کریں، ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے، قاضیوں، والیوں اور دوسرے عہدہ داروں پر خبر رسانوں کی نگرانی ضروری ہے، اور جب تک وہ عادل اور ثقہ نہ ہوں ان کی بھیجی ہوئی اطلاعیں قبول نہ کی جائیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ اس زمانہ کی صحت مند پولٹیکل سائنس تھی، جس کو شاہ صاحبؒ نے بھی قلمبند کیا، ہارون رشید نے ان ہی اصولوں کو اپنا رہنما بنایا تھا، اسی لیے اس کا شمار دنیا کے کامیاب ترین حکمرانوں میں کیا جاتا ہے لیکن جب یہ اصول نظرانداز ہوتے رہے تو حکومت زوال کی طرف مائل ہو کر ختم ہوگئی۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی تاریخ اسلام کی چوتھی جلد ختم کرلی تو برابر اپنی نجی صحبتوں میں کہتے رہے کہ وہ بنو عباس کی علمی اور تمدنی تاریخ ایک علٰحدہ جلد میں قلمبند کریں گے، مگر ان کی دوسری مشغولیتوں کی وجہ سے یہ جلد مکمل نہ ہوسکی، البتہ جلد چہارم کے ایک نئے ایڈیشن میں "عباسیوں کا تمدن" کے عنوان سے ۴۶ صفحے کے ایک باب کا اضافہ کیا جو ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیا گیا، وہ لکھتے ہیں کہ اسلام ایک فطری اور سادہ مذہب ہے، اس کا دامن بے جا تمدنی تکلفات سے پاک ہے، گو جائز حدود کے اندر شریعت نے عیش و تنعم کی اجازت دی ہے، لیکن ہر وہ شئے جو سادگی اور جہد و عمل کے خلاف ہو اسلامی روح کے منافی ہے، اسلام کی یہ سادگی خلافت راشدہ کے دور تک قائم رہی، اس زمانہ میں صحرائے عرب میں سونے چاندی کے دریا بہنے لگے تھے، لیکن خلیفۃ المسلمین کے جسم پر وہی پیوند لگا کپڑا

اور غذا میں جو کی روٹی اور روغن زیتون رہا، لیکن دولت کی فراوانی اور مختلف تمدنوں اور قوموں کے اختلاط کے اثرات طبعی ہیں، خلافت راشدہ کے خاتمہ اور صحابۂ کرامؓ کے اٹھنے کے بعد اموی دور ہی سے دوسری قوموں کے اختلاط کے اثرات ظاہر ہونے لگے، اور گو خلفائے راشدین کی طرح ان میں اسلامی روح نہ تھی، لیکن ان کی عربی عصبیت کی وجہ سے ان کی حکومت خالص عربی تھی، اس لیے ان میں غیر عربی عنصر اور اس کے تمدن کا غلبہ نہیں ہونے پایا، لیکن بنو عباس کے عہد کی حکومت، سیاست، تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون عجمی قالب میں ڈھل گئے اس کے اسباب یہ تھے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں میں مذہبی روح کمزور ہونے لگی تھی، پھر عباسی خلافت تمام عجمیوں کے بل پر قائم ہوئی تھی، اس کے بڑے بڑے عہدہ دار عجمی ہی تھے، اس کے علاوہ عباسیوں کا پایۂ تخت بابل اور نینوا کے کھنڈر پر تعمیر ہوا تھا، جس کی آب و ہوا میں عجمی اثرات سرایت کیے ہوئے تھے، اہل عجم نہایت دلکش اور نظر فریب تمدن کے مالک تھے، ان کا اثرانداز ہونا ناگزیر تھا، پھر بھی عربی تمدن بالکل ختم نہیں ہوا، دونوں کی آمیزش سے ایسا دلآویز تمدن پیدا ہوا جو سارے مشرقی ملکوں میں پھیل گیا۔

اس تجزیہ کے بعد شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قوموں کے تمدن کا ایک بڑا مظہر اس کی عمارتیں ہیں؛ ان کا شکوہ و تجمل، بانیوں کی شوکت و عظمت کا نشان اور اس کے نقش و نگار ان کے ذوقِ جمال کی تحریریں ہیں، جن سے ان کی تمدنی تاریخ پڑھی جاسکتی ہے، ان جملوں میں کیسی نکتہ آفرینی ہے، خلیفہ منصور نے بغداد کو جس طرح آراستہ کیا، اس کی پوری تفصیل ہے، یہ معلوم کرکے حیرت ہوتی ہے کہ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ مزدور اور کاریگر روزانہ کام کرتے تھے، پھر اس کے اندر جو محلات قصر الذہب اور مہدیہ بنائے گئے ان کی تفصیل ہے، شاہی ایوان کے شاہزادوں کے محلات، ان کے امرائے دولت اور ارکان حکومت کے مکانات تھے، برامکہ کے محلوں کی عظمت و شان کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بعض محلوں کی

تعمیر میں اس زمانہ میں دو دو کروڑ درہم صرف ہوئے، ہارون رشید کی لڑکی ام حبیب نے اپنے لیے ایک علٰحدہ محل بنوایا جو قصر ام حبیب کے نام سے مشہور تھا، پھر معتضد باللہ نے اپنے لیے جو محل بنوایا وہ بغداد کے تمام محلوں میں سب سے زیادہ عظیم الشان تھا، اس کی چھت اور دیواریں جواہرات اور قیمتی پتھروں سے آراستہ تھیں؛

بغداد کا ذکر کرتے ہوئے خطیب بغدادی کے حوالہ سے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جلالت، عظمت، علماء و اعلام کی کثرت، خواص و عوام کی تہذیب و شائستگی، رقبہ کی وسعت، مکانات، محلوں، گلیوں، پھاٹک بند کوچوں، سڑکوں، بازاروں، مسجدوں، حماموں، سراؤں کی کثرت، آب و ہوا کی خوبی، پانی کی شیرینی، درختوں کی چھاؤں، ان کی ٹھنڈک، سردی و گرمی کے اعتدال، وغیرہ کے لحاظ سے دنیا کا کوئی شہر بغداد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، مگر شاہ صاحبؒ دکھ کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بغداد کی عظمت گذشتہ پر آنسو بہانے والے کھنڈر بھی باقی نہیں رہ گئے ہیں، اب بغداد میں اس کے پرانے شکستہ مقابر کے علاوہ اس کا کوئی مرثیہ خواں بھی باقی نہیں ہے، صرف کتابوں کے اوراق سے اس کی عظمت و شوکت کا پتہ ملتا ہے۔

یہی حال ان محلات کا ہے جو آباد کیے ہوئے نئے نئے شہروں میں بنائے گئے، ایک نئے شہر سامرا میں اتنے محلات تعمیر ہوئے کہ ان کا شمار کرنا مشکل تھا، مورخین نے ان کے کچھ نام یہ لکھے ہیں: عروس، وحید، جعفری، غریب، شیدان، برج، صبیح، ملیح، بستان، تل، برکوان، جوسق، قلائد، غرد، قصر متوکلیہ، بہو، لولؤ، شاہ، حیری، کمین اور اردقہ وغیرہ؛

شاہ صاحبؒ نے عباسیوں کی تمدنی زندگی کے اور پہلوؤں پر جو روشنی ڈالی ہے، ذرا ان کی تفصیل بھی ان ہی کی زبانی سنیے:

عباسیوں کے دسترخوان کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ہارون رشید کے دسترخوان پر ایک وقت میں

تیس تیس قسموں کے کھانے ہوتے تھے، مطبخ کا خرچ دس ہزار درہم روزانہ تھا، مامون کا ذاتی خرچ چھ ہزار اشرفی یومیہ تھا، جس کا بڑا حصہ باورچی خانہ پر صرف ہوتا تھا، معتضد کے عام اور خاص مطبخ کا خرچ دس ہزار اشرفی ماہانہ تھا، باورچیوں کی تنخواہ ایک ہزار اشرفی ماہانہ تھی، قاہر کے دسترخوان پر تیس ۳۰ اشرفی کے روزانہ میوے ہوتے تھے، ان کے امراء کا دسترخوان بھی بہت پرتکلف ہوتا، وزیر ابوالحسن بن فرات کے باورچی خانہ میں تین سو ۳۰۰ اشرفی ماہانہ کا صرف مشک خرچ ہوتا تھا۔

اس دور کے لباس کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ امراء باریک کپڑے کے چھوٹے کرتے، قہستان کے کپڑے کی بنیائن، اسکندریہ کے زیرپوش، دبیق اور چناب کے اعلیٰ درجہ کے نرم اور خوش رنگ کتان کی قمیص، نیشاپور کے ملحم، دبیق کے یکرنگے اور تونس کی طیلسان، عدن کی ولایان، کوفی خز اور سوس کی حاشیہ دار چادریں، نیشاپور کے دھاری دار یکرنگے، بنی سعد کی چھینٹ، کوفی خز کے جبے، دھوپ چھاؤں کی کتان وغیرہ استعمال کرتے تھے۔

عطریات کا بھی ذکر کیا ہے، شوقین مزاج مشک اور گلاب کا محلول، لونگ کے پانی میں بھگویا ہوا عنبر، عنبر عود، بحرین کا عنبر وغیرہ استعمال کرتے تھے، خلیفہ معتضد کی ماں کے لیے ریشم کی جو جوتیاں بنتی تھیں، ان کی تہہ میں مشک وغیرہ پیس کر جمایا جاتا تھا، بیت الخلاء کو خوشبودار بنایا جاتا تھا،

تقریبات کے موقع پر جو تکلفات ہوتے ان کی تفصیل بھی شاہ صاحبؒ نے لکھی ہے، وزیر دولت حسن بن سہل کی لڑکی کی شادی مامون کے ساتھ ہوئی تو ہاشمی امراء، افسرانِ فوج، کاتبوں اور دوسرے بڑے عہدیداروں میں مشک کی گولیاں لٹائی گئیں، ہر گولی میں کاغذ کا پرزہ لپٹا ہوا تھا جس میں زمین جائداد، لونڈی، غلام، گھوڑے اور مختلف چیزیں لکھی ہوئی تھیں، جس کے ہاتھ جو گولی پڑی اس میں جو کچھ تحریر ہوتا اسی وقت مل جاتا، عام لوگوں میں روپے پیسے اور مشک وغیرہ کے گولے لٹائے گئے، مامون اپنی بارات کے ساتھ انیس ۱۹ دن

سسرال میں رہا، رخصتی کے وقت تمام امراء کو علیحدہ علیحدہ تحفے دیے گئے، مامون کے لیے سنہرے کام کا فرش بچھایا گیا تھا، جیسے ہی اس نے اس پر قدم رکھا تو اس کے اوپر بڑے بڑے موتی نچھاور کیے گئے، شب عروسی کی روشنی میں چالیس من موم بتیاں سونے کی لگن میں روشن کی گئی تھیں، اسی طرح معتدر کی ماں نے اپنے صغیر السن پوتے کی ایک تقریب میں چاندی کا ایک چھوٹا سا گاؤں بنوایا تھا، جس کے مکانات، کھیت، فصلیں، درخت، پھل، تالاب، نہریں، گائے، بیل، گھوڑے، اونٹ اور دوسرے مویشی وغیرہ چاندی ہی کے تھے۔

شاہ صاحبؒ نے عباسی دور کے اسی قسم کے دوسرے تکلفات اور تعیشات کا ذکر بڑے طاقتور اسلوب میں کیا ہے، جس کو پڑھنے میں لطف تو ضرور ملتا ہے لیکن یکایک خیال جاتا ہے کہ ان سے اس زمانہ کے مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کی تعمیر ہوئی یا ان کے ذریعے وہ تمام عوامل واسباب جمع ہوگئے جن سے قوموں پر زوال آتا ہے، اعلیٰ تمدن سے تہذیبی زندگی ضرور نکھرتی ہے، اس سے فہم وادراک کو بھی جلا ہوتی ہے، لیکن یہی اعلیٰ تمدن نبرد آزمائی، معرکہ آرائی اور سپہگری کی خصوصیات کو زائل بھی کر دیتا ہے، مسلمان اور ان کے حکمراں متمدن ہوئے تو ان کی تمدنی قوت مدرکہ ضرور بڑھی مگر وہ اس جرأت، قوت ارادی اور عزم سے بیگانہ ہوتے چلے گئے جن کی بدولت وہ دنیا پر چھا گئے تھے، پھر یہی تمدن ان کے زوال کا سبب بن گیا۔

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کا سلسلۂ تاریخ اسلام سولہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس کے چار حصے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے قلم سے ہیں، جو بہت مقبول ہوئے اور ہندوستان و پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔

تاریخ اسلام حصہ اول	تاریخ اسلام حصہ دوم	تاریخ اسلام حصہ سوم	تاریخ اسلام حصہ چہارم
قیمت ۱۶/	قیمت ۱۵/	قیمت ۱۸/	قیمت ۱۹/

دلی کالج کے تعمیری کارناموں پر ایک نظر

از

ڈاکٹر سمیع اللہ، استاذ ٹریننگ کالج، ہندو یونیورسٹی بنارس

دلی کالج کی بنیاد مدرسۂ غازی الدین تھا، جسے سنہ ۱۶۹۲ء میں قائم کیا گیا تھا، اس کے نام کی وجہ سے عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اس کے بانی غازی الدین خاں تھے، اصل واقعہ یہ ہے کہ غازی الدین خان فیروز جنگ نواب آصف جاہ اول بانی سلطنتِ آصفیہ حیدر آباد دکن کے والد اور اورنگ زیب کے معتمد امراء میں تھے، انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اجمیری دروازہ کے قریب اپنے لیے ایک مقبرہ تعمیر کرایا تھا، سنہ ۱۷۱۰ء میں جب ان کا انتقال (احمد آباد گجرات) میں ہوا تو ان کی لاش دلی لائی گئی اور اسے یہیں آسودۂ خاک کیا گیا[1]، سنہ ۱۶۹۲ء میں اسی عمارت میں ایک مدرسہ قائم ہوا جو بانیِ عمارت کے نام پر "مدرسۂ غازی الدین" یا "غازی الدین خان کا مدرسہ" کہلایا۔

کمپنی کی نئی پالیسی کے تحت سنہ ۱۸۲۵ء میں دلی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے اس کا احیاء کیا گیا، بعد میں یہی مدرسہ دلی کالج کے نام سے مشہور ہوا، سنہ ۱۸۲۹ء میں شاہ اودھ کے وزیر اعتماد الدولہ میر فضل علی خان نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیے کی خطیر رقم بصورت وقف گورنمنٹ کو تفویض کی اور سنہ ۱۸۳۰ء میں جب وصیت قلمبند کی گئی تو انھوں نے یہ شرط لکھوائی کہ اسے پانچ فیصد والے قرض میں شامل کیا جائے، اور اس کی

---

[1] مولوی نجم الغنی، تاریخ ریاست حیدر آباد دکن، ص ۰، ۷، (طبع سنہ ۱۹۳۰ء لکھنؤ)

آمدنی سے اس کالج کی امداد کی جائے جو غازی الدین خان مرحوم نے دلی میں عربی و فارسی علوم کی ترقی کے واسطے قائم کیا تھا، جو نرے مذہبی علوم ہیں اور اخلاق کے سرچشمے ہیں۔[1] حکومت نے ان کی اس فیاضی اور دریا دلی کے اعتراف میں ایک کتبہ متبرہ یعنی کالج کے اندرونی صحن کے صدر دروازہ کی اوپری منزل پر نصب کرایا، جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے:

نہ بر لوح نقشے بماند و لیک — چہ ماند عمل ماند و نام نیک

بیاد حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خان بہادر سہراب جنگ کہ یک لک و ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقی علوم در مدرسہ ہذا واقع دہلی خاص مولد و موطن خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودہ اند منقوش گردیدہ در ۱۸۲۹ء

لیکن جب طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا، اور یہ جگہ ناکافی ہونے لگی تو ۱۸۴۴ء میں کالج کو یہاں سے کشمیری دروازے والی عمارت میں منتقل کر دیا گیا، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر کے زمانہ میں اسے بند کر دیا گیا، اس کے سات سال بعد یکم مئی ۱۸۶۴ء کو اسے دوبارہ جاری کیا گیا، لیکن اس کی گئی ہوئی رونق اور چہل پہل واپس نہ آ سکی، چونکہ غدر کے زمانہ میں جب کہ دلی میں انگریزوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا تو پنجاب نے انھیں کمک پہونچائی تھی، اس لیے حالات پر دوبارہ قابو پانے کے بعد انھوں نے اہل پنجاب کے مقابلہ میں دلی والوں کو نیچا دکھانے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی، اس پالیسی کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ دلی کالج کو محکمۂ پنجاب کے انتظام میں دے دیا جائے، اس طرح دلی کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا گیا، لیکن جب اس سے بھی ان کی مراد بر نہ آئی تو اپریل ۱۸۷۷ء میں دلی کالج کو لاہور گورنمنٹ کالج میں ضم کر دیا گیا اور اس کے تمام طلبہ و اساتذہ کو لاہور کالج بھیج دیا گیا۔

---

[1] بحوالہ قدیم دلی کالج از مالک رام ص ۲۰ (طبع ۱۹۶۶ء دلی) [2] بحوالہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، از مولانا عبدالسلام ندوی، ص ۳۰۰ (طبع ۱۹۶۳ء اعظم گڈھ)

دلی کالج کے قیام سے انگریزوں کا مقصد مغربی علوم و السنہ کی تعلیم یا مشرقی زبان و ادب کی ترویج و ترقی یا ہندوستان کے ارباب علم و فضل کی حوصلہ افزائی کر کے ہندوستانیوں کی تالیف قلوب ہو، بہر صورت مغربی و مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کا یہ خوش گوار امتزاج ہندوستانیوں کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دلی کالج نے نہ صرف اردو زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں، بلکہ جدید و قدیم اقدار کے خوش آیند ارتباط و امتزاج کی بنیاد رکھی اور اس جمہوری انداز نظر کی تاسیس و فروغ کا سامان کیا، جو آج ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور جس کی روشنی اور مدد سے ہم اپنے معاشرہ اور ملک کا لائحۂ عمل متعین کرنے میں مصروف ہیں۔

۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب نے یورپ کو صنعتی اعتبار سے بیدار کیا، جس سے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا بھر میں مشینی دور کا آغاز ہوا، حتی کہ انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی ضرورت و اہمیت شدت سے محسوس کی جانے لگی، رفتہ رفتہ ہندوستان کے حالات بھی اس کے متقاضی ہوئے کہ یہاں ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جہاں ہندوستانی طلبہ مشرقی علوم و السنہ کے پہلو بہ پہلو جدید مغربی علوم اور سائنس سے بھی استفادہ کر سکیں، دلی کالج کے نصاب تعلیم کے سرسری مطالعہ سے ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مشرقی علوم کے ساتھ تقریباً تمام مغربی علوم اور مضامین بھی شامل تھے، ہندوستانی طلبہ بڑے شوق و انہماک سے ان جدید علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور سائنس کے عملی تجربات میں پوری دلچسپی لیتے تھے، اور جب وہ گھر جاتے تو اس کے عجائبات اپنے بزرگوں سے بیان کرتے تھے۔

دلی کالج کے ماحول نے وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو مذہبی منافرت، قومی تعصب اور لسانی تنگ نظری سے بلند تر رکھ کر ان میں وسعت قلب اور کشادگی ذہن پیدا کی، ان لوگوں کو جہاں مشرق کی علمی و اخلاقی روایات عزیز تھیں، وہیں مغربی افکار و نظریات سے بھی کسی قسم کا بُعد نہ تھا، یہ طلبہ کالج سے صرف ادیب و شاعر ہی بن کر نہیں نکلے، بلکہ ان میں ڈاکٹر، انجینیر، وکیل اور مورخ بھی ہوتے تھے، اور بہ شرح حاضر دست

ان ہی میں سے بعض لوگ گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں پر بھی مامور کیے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر کالج کی وسیع تر دنیا میں قدم رکھنے کے بعد طلبہ کے مزاج میں جو تغیر اور فکر و نظر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے نتیجے میں ہندوستانی ادب اور معاشرہ میں ایک انقلاب پیدا ہوا، اور ایسی روایات قائم ہوئیں جن کا خوشگوار نتیجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے، اگر دلی کالج نہ ہوتا تو شاید اس دور میں ماسٹر رام چندر، مولانا امام بخش صہبائی، مولوی مملوک العلی نانوتوی، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ضیاء الدین، میر ناصر علی (ایڈیٹر صلائے عام) مدن گوپال (ایڈووکیٹ) اور پیرزادہ محمد بخش (دشن جج) جیسی ہمہ جہت ہستیاں ہندوستان کی سرزمین پر پیدا نہ ہوتیں، دلی کالج نہ ہوتا تو یہ لوگ کیا ہوتے؟ اس کا جواب ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح دیا ہے:

"اگر میں دلی کالج میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگذر) گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علیٰ بصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں، اور جو حقیقت میں شرط انسانیت ہیں ان کو میں نے دلی کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں دلی کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا، مولوی ہوتا، تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسرے کے عیوب کا متجسس، بر خود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"

بہر حال اس سلسلہ میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ دلی کالج نے نہ صرف ایسی شخصیتوں کو جنم دیا، جن کی کوششوں اور کاوشوں سے ہمارے سرمایۂ ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا، بلکہ ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی فعال اور بیدار مغز جماعت بھی پیدا کی جس نے ہندوستان کی تعمیر نو میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اس لیے اگر دلی کالج کو "شخصیتوں کا جنم داتا" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، مولوی عبدالحق نے بالکل صحیح لکھا ہے:

۱ بحوالہ داستان تاریخ اردو از مولوی حامد حسن قادری ص ۳۶۴ (طبع ۱۹۶۶ء آگرہ)

"دلی کالج کے پھل اس کے وہ سپوت ہیں جو اس کی آغوش میں پلے اور پھلے پھولے، اور جنھوں نے علم کے اس نور سے جو ان کے سینوں میں مشتعل تھا اپنے ملک اور اپنی زبان کو جگمگا دیا۔ علم کے وہ پجاری آج ہماری زبان کے دیوتا ہیں۔"

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی بھی اعتراف کرتے ہیں کہ

"اس کالج سے وسیع النظری اور رواداری کی فضا قائم ہوئی، ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات پروان چڑھے، تحقیق و ریسرچ کا ذوق پیدا ہوا، علمی و ادبی بیداری پیدا ہوئی، اردو کے صاحب طرز ادیب و نقاد اور چوٹی کے مصنف اور بلند پایہ شخصیتیں پیدا ہوئیں۔"

ماہرین تعلیمات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر طلبہ کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے، دلی کالج کی سب سے بڑی اہمیت اور خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھی، اور صرف عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کے لیے ہی اردو کا استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ سائنس، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ، قانون اور منطق و فلسفہ کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت تک اردو کسی علاقائی اور مذہبی و ملی تفریق کے بغیر ہندوستان کی مقبول عام زبان بن چکی تھی، دوسرا سبب یہ تھا کہ اس زبان میں تمام موضوعات کے لیے اظہار خیال کا ذریعہ بننے کی صلاحیت موجود تھی، ناظم تعلیمات، احاطۂ بنگال "مسٹر کر" نے کالج کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۸۵۳ء میں اس کی امتیازی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آ رہی ہے جو اسے بالائی اور زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے، اور وہ یہ کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے، اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور سے ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ و اخلاق و فلسفہ (مارل سائنس) کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے اس طریقۂ تعلیم پر

۱ بحوالہ مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق ص ۱۵۶ (طبع ۱۹۴۵ء دہلی) ۲ مقتبس صدا ادریہ آزادی ... عبدالرحمٰن پرواز ص ۱۴ (طبع ۱۹۸۴ء دہلی)

مسٹر بتروس نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اسپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ جاری رکھا، یہ اب دلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جزو تسلیم کر لیا گیا ہے، مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھلنے پھولنے دیا جائے، چند سال بعد ہمیں اس کے نتائج کا دوسرے طریقوں کے نتائج سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا۔"[1]

دلی کالج کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت اردو کے علمی و ادبی سرمایے میں قابل قدر اضافے ہوئے، کالج کے قیام سے قبل اردو میں نہ صرف یہ کہ مغربی علوم و فنون سے متعلق کتابیں نایاب تھیں بلکہ مشرقی علوم پر بھی معقول کتابوں کا فقدان تھا، اردو نثر میں تالیف یا ترجمہ کی صورت میں جو کتابیں دستیاب تھیں وہ فورٹ ولیم کالج کی لکھی ہوئی تھیں اور اکثر و بیشتر قصوں اور کہانیوں پر مشتمل تھیں۔

چونکہ دلی کالج کا دائرۂ کار فورٹ ولیم کالج کے مقابلہ میں زیادہ وسیع تھا، اس لیے یہاں جدید مضامین و موضوعات پر بہ کثرت کتابیں تالیف اور ترجمہ ہوئیں، تاکہ مشرقی شعبے کے طلبہ کو مغربی علوم کے حصول میں دشواریاں پیش نہ آئیں، اس طریقۂ کار سے نہ صرف یہ کہ اردو کے سرمایے میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی مقبولیت بھی عام ہوئی، اور یہ سمجھا جانے لگا کہ ہندوستانی زبانوں میں اردو کو وہ وسعت و ہمہ گیری حاصل ہے کہ اسے یکساں طور پر مشرقی و مغربی دونوں علوم و فنون کے اظہار کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، دلی کالج کے زیر نگرانی ۱۸۴۳ء میں "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی"[2] کا قیام اسی غرض سے عمل میں آیا تھا کہ اردو میں جدید نصابی مضامین سے متعلق کتابیں تیار کرائی جائیں، اس کی کوششوں سے ریاضیات، سائنس، قانون، طب، فلاحت، زراعت، تاریخ و جغرافیہ، اخلاقیات وغیرہ پر تقریباً ایک سو چودہ کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں نئے نئے الفاظ اور مختلف النوع اصطلاحات کا

---

[1] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۷۶ [2] (حاشیہ ص ۲۸۳ پر)

اضافہ ہو گیا، چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ اس تحریک کی بدولت عثمانیہ یونیورسٹی جیسے عظیم ادارے کو معرض وجود میں لانے کی راہ ہموار ہوئی تو بے جا نہ ہوگا، دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دلی کالج عثمانیہ یونیورسٹی کا پیش رو تھا، کیونکہ یہی کالج ہندوستان کی پہلی درسگاہ تھی جہاں مغربی اور جدید علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان میں دینے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کا موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس زمانہ میں (فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد) بعض انگریزوں نے اردو کی لغات، صرف و نحو کی کتابیں، اردو لسانیات اور اردو تاریخ پر بعض کتابیں لکھ کر اردو کے علمی مطالعہ کا آغاز کیا، لیکن فورٹ ولیم کالج کا حلقۂ اثر محدود اور اس ادارہ کے مصنفوں کا مقصد مخصوص تھا، اس لیے ان کے رجحانات نے اس وقت کسی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی، البتہ ۱۸۵۷ء سے کوئی پچیس تیس سال پہلے خود دلی میں ایک ایسا کالج قائم ہوا جہاں پہلی مرتبہ جدید علوم و فنون کی تعلیم مشرقی زبان میں دینے کا تجربہ کیا گیا، اور اس کے لیے انگریزی سے بعض درسی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا"

(حاشیہ ص ۲۸۲ کا) [2] اس کا پورا نام "Socity for the Promotion of Knowledge in India through the Medium of Vernacular Languge" (اشاعت علوم بذریعۂ السنۂ ملکی) تھا، لیکن اتنے بڑے نام کا یاد رکھنا آسان نہ تھا، چنانچہ بعد کے مصنفوں نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے، جن میں دو نام زیادہ مقبول ہوئے، پہلا "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی" اور دوسرا "ورناکولر سوسائٹی" اس سوسائٹی کی دیکھ بھال اور اسے بہتر طریقے سے چلانے کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی، اس کے پہلے سکریٹری فلیکس بوترو منتخب ہوئے تھے، اور اس کے ارکان میں (۱) ٹامس مٹکاف، دلی (۲) چارلس گرانٹ، دلی (۳) ک، ریون شا، دلی (۴) ولیم سان کو ٹن کلکتہ اور (۵) دوار کا ناتھ ٹیگور شامل تھے۔

(اس طرح) مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ایک اہم حصہ آہستہ آہستہ اردو میں منتقل ہونے لگا تھا، جس کے ساتھ زبان میں نئے نئے الفاظ و اصطلاحات کا بھی اضافہ ہو رہا تھا۔"[1]

دلی کالج سے قبل ہندوستان میں عام طور پر تین قسم کی درسگاہیں پائی جاتی تھیں، اولاً وہ مکتب اور مدرسے جو مسلمانوں کی طرف سے چلائے جاتے تھے اور جن میں عربی، فارسی اور اسلامیات کی تعلیم دی جاتی تھی، یہ درسگاہیں مسلمانوں کے مذہبی شغف اور عقائد کی نمائندگی کرتی تھیں، اور ان کے قیام کے پس پشت ثواب اور اجر آخرت کا جذبہ کارفرما رہتا تھا، دوسری قسم کی درسگاہیں وہ ہوتی تھیں جنھیں ہندو قائم کرتے تھے، اور جو ودیا مندر یا پاٹھ شالہ کہی جاتی تھیں، مسلمانوں کے مکاتب و مدارس کی طرح یہ ادارے بھی دھارمک شکشا کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے، چنانچہ ان میں سنسکرت اور دھرم شاستر کی تعلیم کو اولیت دی جاتی تھی، تیسری قسم کی درسگاہوں کے تحت وہ اسکول آتے تھے جن کا نظم و نسق انگریز مشنریوں، پادریوں اور چیلنوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور جو عیسائیت و مسیحیت کی تعلیم و تبلیغ کی غرض سے کھولے جاتے تھے، ان اسکولوں میں انگریزی زبان کی تعلیم کو ترجیح دی جاتی تھی۔

ان روایتی قسم کے تعلیمی اداروں کے برخلاف دلی کالج ایک ایسا تعلیمی ادارہ تھا جس میں بیک وقت عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور انگریزی زبانوں کے پہلو بہ پہلو دوسرے مشرقی و مغربی علوم و افکار کی تعلیم بھی کما حقہ طور پر دی جاتی تھی، مولوی عبدالحق کے الفاظ میں "یہی وہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا (اور جہاں) ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔"[2]

دلی کالج کی ایک اور خصوصیت جو اسے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے یہ تھی کہ اس کا فیضان ہندو، مسلمان اور عیسائی تمام فرقوں کے طلبہ کیلئے عام تھا، یہاں سب ایک ساتھ بیٹھتے اور اس

[1] "ماہ نو" کراچی، ستمبر ۱۹۵۳ء ص ۱۳-۱۲
[2] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۰۲۔

مائدۂ علم سے یکساں طور پر مستفیض ہوتے تھے، ٹھیک یہی بات اساتذہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، ان میں بھی ہندو، مسلمان، عیسائی، ملکی اور غیر ملکی سبھی شامل تھے، کالج کے پرنسپل برطانوی (ٹیلر، کارگل، بیٹن، ولوٹ اور رگک)، جرمن (اسپرنگر) اور فرانسیسی (بوترو) قوم کے ہوئے، لیکن باقی اساتذہ میں ہندوستانیوں کی کثرت تھی جن میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہ تھی، ان تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی کالج ایک ایسی بین الملکی انجمن کی حیثیت رکھتا تھا جہاں ہندوستان، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی کے ہندو، مسلمان اور عیسائی علماء و فضلا، سر جوڑ کر بیٹھتے، نژاد نو کی تعلیم و تربیت کے لیے نئے نئے منصوبوں کو عملی شکل دیتے اور علم کی ضیا پاشیوں سے طلبہ کے دل و دماغ کو منور کرتے تھے، باہمی ارتباط و اختلاط کے اس ماحول میں تربیت یافتہ طلبہ اور ان کے اساتذہ کے درمیان گاہ بگاہ مذہبی، ثقافتی، سائنسی اور سیاسی موضوعات و مسائل پر مذاکرات بھی ہوتے رہتے تھے، اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب تک دلی کالج قائم رہا مفید علمی تبادلۂ خیال اور ثقافتی لین دین کا کام گزر رہا، اس میں شبہ نہیں کہ یہاں کے طلبہ اور اساتذہ مختلف و متنوع خیالات و نظریات کے حامل ہوتے، کوئی مغربی تہذیب و ادب کا گرویدہ ہوتا تو کوئی مشرقی تمدن اور علوم و السنہ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا، ذوق کی اس بوقلمونی اور افکار و نظریات کی اس رنگا رنگی نے ہندوستانی طلبہ و اساتذہ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کے نتیجے میں خیالات کی تبدیلی، فکر کی اصلاح اور معلومات میں اضافے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس سے نہ صرف افادی ادب کی بنیاد پڑی، بلکہ نئے سائنسی اور تہذیبی دور کا آغاز بھی ہوا، اور ہماری نسلوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جس میں فکر و خیال کی اس نئی رو کے زیر اثر ہمارے ملک میں ایسے روشن ضمیر اور بالغ النظر افراد پیدا ہوئے جنھوں نے ہمارے معاشرے اور ادب کا رخ تعمیر و ترقی کی ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا، ان کے احسانات ہماری علمی و تہذیبی تاریخ میں قائم و دائم رہیں گے، اپنی ان متنوع و گوناگوں خدمات و خصوصیات کے باوصف دلی کالج ہمیں ایسا کوئی ادبی شاہکار ورثے میں نہیں دے سکا جس کی لازوال قدر و قیمت خواص کی طرح عوام میں بھی اس کا نام اور شہرت و مقبولیت برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی، اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی طرح یہاں بھی خالص ادبی اور علم ادبی کے موضوعات اور مباحث پر

متعدد کتابیں تالیف یا ترجمہ کی گئیں،[1] لیکن ان میں میرامن کی "باغ و بہار" شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی" اور "قصہ حاتم طائی" بہادر علی حسینی کی "اخلاق ہندی"، نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق" خلیل علی خاں اشک کی "داستانِ امیر حمزہ" جیسا قبول عام کسی کتاب کو حاصل نہ ہو سکا، دلی کالج کی کتابیں فورٹ ولیم کالج کی ان کتابوں کے تقریباً چالیس پینتالیس سال بعد وجود میں آئی تھیں، اس اعتبار سے انھیں ادبی چاشنی اور لسانی لطافت و نفاست سے اور زیادہ مزین اور مملو ہونا چاہیے تھا، لیکن یہاں کے مصنفین و مترجمین نے اس پہلو پر مناسب توجہ نہیں دی، اس لیے ان کے کارنامے ادبیت کے اس اعلیٰ اور ارفع معیار تک پہونچنے میں ناکام رہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کالج کا ماحول اور اس کے مطالبات و مقتضیات فورٹ ولیم کالج کے ماحول اور اس کے اغراض و مقاصد سے یکسر مختلف تھے، یہاں تمام تر زور مغربی علوم و فنون کی توسیع و ترقی اور ترویج و تشویق پر صرف کیا گیا اور ادب کی طرف کسی نے خاص توجہ مبذول نہیں کی، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے بقول "انگریزی اثر سے بنگال میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی وہ زیادہ تر ادبی تھی، لیکن دلی میں اس کی حیثیت سائنسی ہے"[2]

دلی کالج کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت مقالہ نگاری اور صحافت کو فروغ حاصل ہوا اور اردو کے طلبہ اور قارئین جدید علوم و فنون خصوصاً مغربی فلسفے اور سائنس سے روشناس ہوئے، اس کالج نے مشرقی و مغربی علوم پر متعدد مفید اور کارآمد کتابیں مرتب کرکے جدید اور قدیم کے خوشگوار امتزاج سے ایک ایسی شمع روشن کی جو آج بھی جادہ فروزانِ شوق کے لیے مشعل راہ بنی ہوئی ہے، اور جس کی ضیا پاشیوں سے ہماری علمی تاریخ کا ایک باب رہتی دنیا تک منور اور تابناک رہے گا۔

---

[1] ان میں الف لیلہ، سفر یوسف خان کمبل پوش کا انگلستان میں، چشمۂ فیض، قصۂ یوسف سلیمانی، عجائبات روزگار، راجبین، مہابھارت اور سنسکرت اور انگریزی ڈرامے کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ [2] بحوالہ مقدمہ "ماسٹر رام چندر" از صدیق الرحمٰن قدوائی، ص ۲۴ (طبع ۱۹۶۱ء دہلی یونیورسٹی)

اسلام اور مستشرقین

پر

دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا: آپ خیال فرمائیں کہ ان مستشرقین نے ہمیں کیا معلومات دیں، وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ترقی یافتہ ملکوں میں رہنے کی حیثیت سے حقیقت پسند اور صداقت کے جویاں ہیں، مگر میں ان سے عربوں اور مسلمانوں کی طرف سے پوچھتا ہوں کہ انھوں نے عربوں کی کیا تصویر پیش کی، اسلامی تمدن کی کیا مرقع آرائی کی، اس کے اہم ارکان توحید، رسالت، نماز اور روزہ ہیں، ان کی کیا تصریح کی؟ انھوں نے صرف یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام کے دو رکن ہیں، ایک حرم سرا اور ایک اونٹ، انھوں نے دو چار سو برسوں میں کیا کام کیا؟ سیل نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا، پروفیسر اربری نے بڑی شہرت حاصل کی، منٹگمری واٹ آج کل بہت نمایاں ہیں، مگر انھوں نے کیا ذہنی تربیت کی؟ امریکہ عرب ملکوں اور خصوصاً مشرق وسطیٰ سے متعلق بڑے بڑے فیصلے کر بیٹھتا ہے، مگر اسلام کے متعلق اپنے ملک کو کیا روحانی غذا فراہم کی، وہاں کا ایک متوسط درجے کا آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اسلامی تمدن کے دو سمبل ہیں، ایک حرم سرا کی وسعت اور دوسرا اونٹوں کی کثرت، یہ انسانیت اور خود ان کے ملک کی سیاست کی کون سی خدمت ہوئی، فوج کہیں داخل ہوتی ہے تو پہلے ہراول یا طلیعہ بھیجا جاتا ہے،

تاکہ فوج آگے بڑھے تو وہ ملک کے لوگوں کے مزاج، وہاں کی روایات، وہاں کی تہذیب اور وہاں کی زبان سے واقف ہو، تاکہ اس کو اندازہ ہو کہ وہ کس ملک میں قدم رکھ رہی ہے، اور وہاں کے لوگوں سے کس طرح پیش آئے اور ان کے مسائل سے کس طرح نپٹے اور وہاں کے لوگوں سے کس زبان میں باتیں کرے، کیا ہمارے مستشرقین کا بھی رویہ رہا ہے؟ میں آپ سے نہیں اپنے ضمیر سے معذرت کرتے ہوئے ایک تلخ حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور اس کے اظہار کے لیے ایسی موزوں جگہ ابھی تک نہیں ملی، مستشرقین کے ایک گروہ نے تخریبی اور صلیبی فرض انجام دیا ہے، ان کے دلوں میں صلیبی جنگ کی جو کدورتیں تھیں، اس کی ہزیمت کے جو داغ تھے، انھوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ اسلام جو ایک پیغام ہے، جو ایک زندہ جاوید تحریک ہے، جو خود ایک زندگی ہے، اس سے یورپ کو جس کے ہاتھ میں قیادت آنے والی تھی، محروم رکھا جائے، اس کی صحیح تصویر سامنے نہ آئے، یہ بہت بڑا ظلم ہوا، میں اس کا شاکی نہیں ہوں اور نہ یہ ادارہ اس کا شاکی ہے بلکہ یورپ اور امریکہ کو شاکی ہونا چاہیے، ان کا دامن گیر ہونا چاہیے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ روز انصاف دور نہیں جب خود امریکہ اور یورپ کی عقلیت پسندی کے دور میں یہ حقیقت آشکارا ہوگی، یورپ کے حقیقت پسند معاملات کو ریاضی کے اصولوں بلکہ علمی اصولوں سے جانچنے کے عادی ہیں، وہ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ مستشرقین نے انھیں کیسے دھوکے میں رکھا، اور اسلام سے فائدہ اٹھانے سے روکا، روز حشر میں نئی نسل کے روشن ضمیر اور جری افراد کے ہاتھ ان مستشرقین کے دامن اور گریبان پر ہوں گے کہ انھوں نے لڑائیوں میں بے ضرورت مصروف رکھ کر ان کو غلط فہمیوں میں مبتلا رکھا اور صحیح حقیقت نہیں بتلائی۔

عالم اسلام میں چار ملک بلا واسطہ رو در رو مغربیت سے دوچار رہے، جب مغربیت کا لفظ بول رہا ہوں تو اس سے مغربی سیاست، مغربی طریق افکار، مغربی تصورات، مغربی جذبات اور احساسات مراد ہے، ہاں تو جن چار ملکوں کا آمنا سامنا مغربیت سے ہوا، وہ ترکی، مصر، ہندوستان اور ایران ہیں، ان ملکوں میں مغربی زبانوں میں ہمارے مسلم فضلاء کو بہت بڑا کام کرنا تھا، یہ فرض عین تھا فرض کفایہ نہیں

بہت سے لوگوں کے حق میں فرض عین تھا، ورنہ فرض کفایہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا، ان کو سارے کام چھوڑ کر یہ فرض انجام دینا تھا تاکہ وہ اپنی نئی نسل کو ان سمی اثرات سے محفوظ رکھیں اور غذائے صالح مہیا کرتے رہیں، اس لیے کہ یہ تقدیر انسانی اور سنت الٰہی ہے کہ خلا نہیں رہ سکتا، خلا غیر طبعی ہے، کوئی خوبصورت کی چیز مہیا نہ کی جائے تو آپ زیادہ دیر تک خلا باقی نہیں رکھ سکتے، آپ کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غذا کہیں اور سے حاصل نہ کرے، ضرورت اس کی تھی کہ ہمارے فضلا، وہ غذائے صالح فراہم کر دیتے جس سے ہمارا نوجوان طبقہ مطمئن ہوتا، اور وہ اپنے کو متعفن اور مسموم غذا کی طرف لے جانے پر مجبور نہ پاتا، لیکن افسوس ہے کہ جہاں تک میں واقف ہوں کہ کم سے کم ترکی، مصر اور ایران میں یہ کام بقدر ضرورت بھی نہیں ہو سکا، ترکی کا تعلق جرمن زبان، مصر کا پہلے فرنچ، پھر انگریزی اور ایران کا فرنچ اور انگریزی دونوں سے رہا، جہاں تک میری معلومات ہیں، ان زبانوں میں ان ملکوں میں کوئی بڑا اور کوئی وقیع کام نہیں ہوا، عرب ممالک سے بھی بڑی کوتاہی ہوئی، وہ مغربی زبانوں میں وہ ٹھوس اور وسیع اسلامی لٹریچر پیش نہیں کر سکے، جس کا نوجوان طبقہ بھوکا تھا، بلکہ اس کے لیے وہ بے تاب تھا، عربی زبان میں بے شک فرسٹ گریڈ کی چیزیں لکھی گئیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ترکی اور مصر میں ان موضوعات پر جن پر مستشرقین لکھ رہے تھے، کام نہیں ہوا، اور ہوا تو وہ ناقابل ذکر ہے، یہ کہنے میں مجھے فخر ہو رہا ہے اور اس کے کہنے میں سب سے بہتر جگہ یہی ہے کہ کمیت، کیفیت، جوہر اور قدر و قیمت کے لحاظ سے سب سے زیادہ کام ہندوستان میں ہوا، گو مجھ کو اس کا بھی شکوہ ہے کہ جتنا عرصہ ہماری مسلمان نسل کو انگریزی زبان و ادب میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ملا، اس لحاظ سے کام تشفی بخش نہیں ہوا، اگر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۸۲ء کی مدت کو سامنے رکھیں تو اس طویل مدت میں جتنا کام ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا، اس کے مقابلہ میں ہمارے قدیم مدرسوں کے علماء نے ان زبانوں میں جن کے وہ ماہر تھے، زیادہ کام کیا، اور جیسا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے میرے والد مرحوم کی کتاب یاد ایام کا پیش لفظ لکھتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ یہ ایک مولوی کے

طبقہ کی پیشکش ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ کیا نمونہ پیش کرتا ہے، اور پھر یہ شعر لکھا تھا

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یہاں عربی میں بعض ایسے عظیم الشان کام ہوئے ہیں کہ جو بظاہر ایک آدمی کا کام نہیں معلوم ہوتا، میں کبھی کبھی کہتا ہوں کہ قدیم مدرسہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک آدمی وہ کام کرتا ہے، جو ایک اکادمی کرتی ہے، ایک آدمی اور اکیڈمی، معجم المصنفین کے بیس ہزار صفحات میں چالیس ہزار شخصیتوں کے تذکرے ہیں، ان جلدوں کو تنہا مولانا محمود حسن خان ٹونکی نے لکھا، صاحب نزہۃ الخواطر نے ۵۳ - ۵۴ سال کی عمر میں آٹھ جلدوں میں چار ہزار سے زائد شخصیتوں کا تذکرہ ایسا منضبط کر دیا ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر کوئی اور مرجع نہیں، ایسے ہی ان کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" ہے، جس سے ہمارے دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی خوب واقف ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سو برس میں جتنا کام ہونا چاہیے تھا، وہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے نہیں ہوا، پھر بھی اس عرصہ میں یہاں جو کام ہوا اس کی نظیر عالم اسلام میں نہیں، امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کے بہت سے مقامات سے مجھے بھی اختلاف ہے، طرز فکر سے اختلاف کرنا ہر صاحب علم کا حق ہے، لیکن جس طاقتور انگریزی زبان اور جس ادیبانہ بلکہ ساحرانہ زبان میں یہ لکھی گئی اس کا اعتراف اہل زبان بھی کرتے ہیں، کسی اسلامی ملک میں اس سے زیادہ موثر اور طاقتور زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اسی طرح ان کی کتاب "ہسٹری آف سرسینس" میں جو روانی ہے اور جس فاضلانہ بلکہ مستشرقانہ انداز میں اس کے مواد کو جمع کر دیا گیا ہے اس کی مثال بھی کم ملے گی، پھر قرآن مجید کے بہترین انگریزی ترجمے بھی اسی سرزمین میں ہوئے، ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ، پکتھال صاحب کی میننگ آف دی گلوریس قرآن بھی ہندوستان ہی کی رہین منت ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی کا فاضلانہ اور محققانہ ترجمہ بعض حیثیتوں سے بالکل منفرد ہے، پھر بھی حضرات! یہ واقعہ ہے کہ اس سو برس میں جو کام اس سلسلہ میں ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہو سکا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اگر ہم آج بھی یورپ اور امریکہ جائیں اور ہم سے کہا جائے کہ

ہم اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس ہندوستانی مصنفین کے سوا کوئی اور کتاب نہیں، علامہ اقبالؒ کی کتاب "ری کنسٹرکشن آف اسلامک تھاٹ" کے بعض مقامات سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اختلاف تھا، لیکن اگر کوئی شخص اسلامی فکر کی بلندی، عمق اور گہرائی سے متاثر ہونا چاہے تو علامہ اقبال کی اس کتاب کو پڑھے، آج بھی اگر کسی شخص کے دل میں سیرت اور صاحب سیرتؐ کی محبت کی طلب ہے تو خطبات مدراس کا مطالعہ کرے، اس کا انگریزی ترجمہ دی گلوریس پرافٹ کے نام سے ہماری مجلس نشریات و تحقیقات نے شائع کیا ہے، اس کا عربی زبان میں ترجمہ "الرسالۃ المحمدیہ" ہمارے فاضل دوست مولانا محمد ناظم ندوی نے کیا ہے: علامہ یوسف قرضاوی منھ بھر کر اس کی تعریف کرتے ہیں، سیرۃ النبی پر اس سے بہتر اور ایسی مختصر اور جامع کتاب دوسری نہیں، یہ کام اس سو برس میں انجام پایا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے جن لوگوں کے ذہن میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا، ان میں علامہ شبلی نعمانی کو اولیت حاصل ہے، ان ہی میں نواب عماد الملک اور چند دوسرے لوگ بھی تھے، سرسید کے خیالات اور ان کی تفسیر کے بعض مقامات سے اختلاف ہے لیکن وہ پہلے شخص ہیں جن کے دل پر سرولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" پڑھ کر چوٹ لگی، انھوں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اب زمانہ کس رخ پر جا رہا ہے اور ہمیں کس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے، اور کس طرح سیرۃ النبیؐ اب لکھی جانی چاہیے، میں علم دین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور علی گڑھ کے اہم ترین افراد کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ سرسید پہلے شخص ہیں جن کے دل پر ایک چوٹ لگی اور ان کی مغفرت کے لیے یہ کافی ہے کہ جب وہ سرولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کیلئے لندن گئے اور وہاں سے انھوں نے محسن الملک کو جو خطوط لکھے ان میں یہ بھی ہے کہ میرے ظروف، میرے گھر کے برتن فروخت کر کے مجھے پیسے بھیجے جائیں تاکہ میں کام انجام دے سکوں، ان کے ساتھ ان کے کام کے مددگار مولوی چراغ علی وغیرہ بھی تھے، میں یہ کہنے کے لیے معافی کا خواستگار ہوں کہ ان کا طرز مدافعانہ اور معذرت آمیز ضرور تھا، لیکن ہمیں کسی چیز کو اپنے زمانہ اور ماحول سے الگ کر کے دیکھنا

نہیں چاہیے، کسی چیز کو اس کے ماحول سے نکال کر کسی اور ماحول میں پہونچا کر کوئی حکم لگانا بڑی زیادتی ہے
ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت کے حالات کیا تھے، زمانہ کا بھی ایک تقاضا ہوتا ہے۔

ہمیں یہ فخر ہے کہ ادب اسلامی پر پہلا سیمینار ندوۃ العلماء، لکھنؤ کو بلانے کا شرف حاصل ہوا، عربی زبان کا امام مصر ہے، سعودی عرب کی تو وہ زبان ہی ہے، اور وہیں سے عراق اور شام وغیرہ بھیجی گئی، اللہ تعالیٰ نے ندوہ کے خادموں کو یہ خیال اور شرف بخشا کہ انھوں نے ادب اسلامی پر ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد کیا، جو بہت کامیاب رہا اور اس کی صدائے بازگشت ابھی تک سنی جا رہی ہے، اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سب سے پہلا سیمنار ہندوستان ہی میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ ٹھوس اور سب سے قیمتی کام یہیں انجام پایا اور پھر ہندوستان میں ہونا تھا تو اعظم گڈھ ہی سب سے موزوں جگہ تھی، اور مزار شبلیؒ ہی سے چند گز کے فاصلہ پر، اور دارالمصنفین کی دیوار کے سائے میں ہونا چاہیے تھا، لیکن حضرات! ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں هزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

علم و تحقیق کا کوئی کام آخر نہیں ہوتا ہے، علم میں کوئی چیز آخر نہیں کہی جا سکتی، علامہ شبلیؒ کی خدمات آج بھی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں، ان کی سیرۃ النبیؐ اور الفاروق آج بھی بے مثال ہیں، الجزیہ فی الاسلام، حقوق الذمیین، کتب خانۂ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر آج بھی اہمیت کی حامل ہیں، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کتب خانہ اسکندریہ پر جب ان کا مضمون شایع ہوا تو کالج کے مسلمان طلبہ کا سر فخر سے اٹھ گیا، وہ دن رات یہ طعنہ اپنے انگریز استادوں سے سنا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ کو جلا دیا، اس میں آگ لگا دی، مسلمان طلبہ اب ان کو فخر کے ساتھ جواب دینے لگے، اب تو ڈاکٹر ہٹی نے بھی اپنی کتاب اے شارٹ ہسٹری آف دی عربس، میں بڑے مدلل طریقہ سے اس کا انکار کیا، اب کوئی صاحب علم اس کے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے اس کتب خانہ کو جلایا، لیکن ہم آپ

اندازہ نہیں کر سکتے کہ علامہ شبلیؒ کے مضمون سے پہلے مسلمان طلبہ کو کس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کو اٹھتے بیٹھتے یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ مسلمان تو علم دشمن ہیں، علم سوز ہیں، کتاب سوز ہیں، لیکن مولانا شبلیؒ کے مدلل مضمون کے بعد ان طعنہ زنوں کو مسلمان طلبہ خاموش کر دیتے تھے،

اس سیمنار میں شرکت کے لیے عرب، پاکستان اور تھائی لینڈ سے فضلاء آئے ہوئے ہیں، تاکہ وہ یہ شہادت دیں کہ علامہ شبلیؒ نے غلطی نہیں کی، انھوں نے سفر کا رخ غلط طریقہ سے متعین نہیں کیا تھا، انھوں نے کوہ کندن اور کاہ بر آوردن پر عمل نہیں کیا، انھوں نے صحیح سمت اور رخ متعین کیا، اور جو لوگ کشتیاں جلا کر دنیا اور دنیا کی تمام ترقیوں اور آسائشوں سے آنکھیں بند کر کے اس آستانہ شبلی و سلیمان پر بیٹھے ہیں، وہ غلطی نہیں کر رہے ہیں، وہ عالم اسلام کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، ان کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

میں دارالمصنفین کے ذمہ داروں کو جن میں خوش قسمتی سے میں بھی شریک ہوں اور خود بھی اس مبارکباد کو بلا کسی تواضع و انکسار کے قبول کرتا ہوں اور اپنے رفقاء، پورے ضلع اعظم گڈھ، شہر اعظم گڈھ اور ان سب لوگوں کو جن کو علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے جذباتی و ذہنی تعلق ہے، مبارکباد دیتا ہوں کہ اس سیمنار کے انعقاد سے مدتوں کی تمنا پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کو مبارک فرمائے اور اس سے علم کا کارواں آگے بڑھے"،

یہ ایمان پرور خطبہ ہزاروں کے مجمع میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے سنا گیا، اور سامعین کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ محض ایک خطبہ نہیں سن رہے ہیں بلکہ اس سے بہت کچھ حاصل بھی کر رہے ہیں، جس سے ان کی ذہن میں جلا اور قلب میں سکینت پیدا ہو رہی ہے، اس خطبہ کے بعد مولانا سعید الرحمن ندوی ایڈیٹر البعث الاسلامی و استاذ عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مہمانوں کا تعارف عربی میں کرایا اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین نے اس کام کو اردو میں انجام دیا، پھر باری باری یہ معزز مہمان

اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کرنے کے لیے اسٹیج پر مدعو کیے گئے۔

ڈاکٹر محمد محمود طنطاوی سب سے پہلے ابوظبی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ شریعت وقانون اسٹیج پر تشریف لائے، اور انھوں نے عربی میں مجمع کو مخاطب کیا، بعد میں اس کا اردو ترجمہ مولانا سعید الرحمٰن ندوی نے کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج ہم اپنے بھائیوں سے مل رہے ہیں جن سے ملنے کی تمنا بہت دنوں سے دلوں میں موجود تھی، مجھے آپ سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اور ہم کو ہمیشہ ملاتا رہے، اس مبارک مجلس میں متحدہ عرب امارات یونیورسٹی اس کے ریکٹر اور اساتذہ کی طرف سے آپ حضرات کو ان کا سلام پیش کر رہا ہوں، ان کی نمائندگی کی عزت حاصل کر کے ان کے بہترین جذبات بھی آپ کے لیے ساتھ لایا ہوں، میں اس سمینار کے ذمہ داروں کا بھی بہت شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ہمیں یہاں آنے کا موقع فراہم کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جس نیک مقصد کے لیے یہ اجتماع ہو رہا ہے' اس میں پوری کامیابی ہو، اس کا ایک بہت اہم مقصد ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے جو کچھ ابھی فرمایا اس میں ہمارے لیے بہت بڑی رہنمائی ہے، ان کی باتوں کی روشنی میں ہم چل کر بہت کچھ اس سمینار سے فائدے اٹھا سکتے ہیں' جن سے ہمارا صحیح مقصد حاصل ہو، امید ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کے تعاون سے آگے بڑھیں گے، اور اپنے اصلی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

جناب حکیم محمد سعید اس کے بعد جناب حکیم محمد سعید ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی اسٹیج پر اپنی مخصوص سفید شیروانی میں آئے تو حاضرین کی نظریں ان کی وجیہ اور شکیل شخصیت پر جمی ہوئی تھیں' انھوں نے فرمایا:

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن و معزز حاضرین! میرا یہ بڑا خوش گوار فرض ہے کہ میں منتظمۂ موتمر کا شکریہ صمیم قلب سے ادا کروں کہ انھوں نے از راہ لطف و کرم مجھے اس عظیم اجتماع میں شرکت کی دعوت دی اور پھر آپ کی خدمت میں یہ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ

آپ نے مجھے اس کا موقع بھی عطا فرمایا کہ میں اس موتمر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ارباب دانش کے سامنے کروں، مجھ کو سب سے پہلے یہ اعتراف کرنا ہے کہ ہم اس خطۂ زمین پر جمع ہیں جہاں سیرت رسول ؐ لکھی گئی اور اس کی برکت یہاں اور اس وقت سایہ فگن ہے آپ سب واقف ہیں کہ دارالمصنفین کے عظیم ادارہ کا آغاز اسی ارادہ سے ہوا تھا کہ سیرت نبویؐ لکھ کر اس کی تکمیل کی جائے، تاکہ اس کے مطالعہ سے لوگ مستفید ہوتے رہیں، اس موتمر کا عنوان "الاسلام والمستشرقون" کئی اعتبار سے ہمارے لیے قابل توجہ ہے، اس موضوع پر ہمارے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈال دی ہے، اور علامہ شبلی نعمانیؒ اور جناب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے جو اقتباسات ناظم دارالمصنفین نے پیش کیے ہیں وہ اور بھی باعث فکر و توجہ ہیں، مجھے یقین ہے کہ جس شاندار انداز سے اس موتمر کا انتظام کیا گیا ہے' اس کے نتائج ان شاء اللہ تعالیٰ دور رس ہوں گے، اور ہم مستشرقین کے خیالات کی اصلاح اور تردید کر سکیں گے، علوم وفنون کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی علم دائرۂ اسلام سے خارج نہیں، لیکن ہم نے جس انداز سے علوم وفنون سے تغافل برتا ہے' اس پر بہت احتیاط سے ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے، اگر یہ موتمر ہمارے اور عالم اسلام کے لیے کوئی لائحۂ عمل بنا سکے جس سے ہم اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہو سکیں تو یقیناً یہ ایک عظیم کامیابی ہوگی، میں اپنے لیے یہ خوش گوار فرض سمجھتا ہوں کہ آخر میں اپنی' اپنے ادارہ اور پاکستان کی طرف سے اس موتمر کے منتظمین کو مبارکباد دوں کہ انھوں نے یقیناً یہ ایک نہایت نیک قدم اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں میں برکت عطا فرمائے۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی اس وقت اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ اسلام آباد میں پروفیسر، موتمر عالم اسلامی کے آنریری ڈائرکٹر جنرل اور بین الاقوامی المجمع العلمی لرابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے رکن ہیں، وہ اسٹیج پر آئے تو اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے ناظم دارالمصنفین کی دعوت ملی کہ میں اس اجتماع میں شرکت کروں تو شکر گذاری سے زیادہ اپنے اوپر ایک

بوجھ محسوس ہوا، اتفاق سے انہی دنوں مجھے ایک ڈگری لینے کے لیے بنکاک جانا تھا، اس کے بعد مکہ مکرمہ گیا، وہاں سے آیا تو صرف تین گھنٹے اسلام آباد میں ٹھہر کر یہاں آگیا، اور محض اس شوق میں آیا کہ دارالمصنفین ہی پہلا ادارہ ہے جو مستشرقین کے زہر کا تریاق پیش کر رہا ہے، اسلام پر مستشرقین نے جو کام کیا ہے اس کی بناء جھوٹ پر ہے، وہ بار بار جھوٹ بول کر اس کو سچ کا درجہ دے دیتے ہیں، مشہور مثل ہے کہ جھوٹ چوبیس گھنٹے آگے نکل جاتا ہے، سچ دوڑتا ہی رہتا ہے، لیکن پیچھا کر نہیں پاتا، انھوں نے اچھے کام ضرور کیے ہیں، کتابیں چھاپی ہیں، ان کا انڈیکس بھی بنایا ہے، لیکن انھوں نے یہ کام دل سے نہیں کیا، ان سے کہا گیا، اس کی اجرت پائی، اس لیے یہ کام کرتے رہے، لیکن جب کبھی اپنے دل سے کوئی بات کہی یا لکھی تو کہیں ڈنک مار دینے کا موقع نہیں چھوڑا، ہم اس کو بہت غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر پہلا سیمنار آپ کے دارالمصنفین میں ہو رہا ہے، دارالمصنفین آپ کے لیے باعث فخر ہے، ہمارے لیے باعث فخر ہے، اور سب کے لیے باعث فخر ہے کہ وہ کسی تعصب کے بغیر علمی کام کر رہا ہے اور یہ ہر قسم کی معاونت کا سو فی صدی مستحق ہے، ہمارے لیے یہ مسئلہ اہم رہا ہے کہ مستشرقین جو زہر پھیلا رہے ہیں اس کے علاج کی کیا ترکیب کی جائے، اللہ کرے کہ ہم ایک پروگرام بنا کر اس کے لیے کچھ کر سکیں، اور اس کی جگہ دارالمصنفین ہی ہو سکتی ہے، اور قطعی طور پر ہو سکتی ہے، یہ کام یہیں سے شروع ہو، اسی شوق کی بنا پر میں آپ کے یہاں کھنچ کر آ گیا ہوں، یہ واقعہ ہے کہ اگر یہاں یہ کام نہیں ہوا تو کہیں نہیں ہوگا، اس وقت اتنے اہل فضل و کمال جمع ہو گئے ہیں ان سب کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب عیسائیوں سے خلافت راشدہ کے زمانہ کی فوجوں نے شام، عراق اور مصر کی سرزمین حاصل کی تو ان کا غصہ کبھی ٹھنڈا نہیں ہوا، اور ان کے انتقامی جذبات کبھی مردہ نہیں ہوئے، یہ تلوار کے ذریعہ سے صلیبی جنگ کی شکل میں ابھرے اور ان کا قلم تو برابر چلتا رہا، ان کے اولین مستشرق کو تو اللہ نے ہدایت دیدی کہ وہ مسلمان ہو گیا، اس کے بعد سے جتنا کام ہوا تو ان کا رخ بدلا ہوا ہے، اسلام کا مقابلہ آج

کمیونزم سے ہے، اس کا لب و لہجہ بھی بدلا ہوا ہے، لیکن یہ نہ سمجھیے کہ ان کا لائحہ عمل بدل گیا ہے، وہ اپنے قلم سے آپ سے اسی طرح لڑ رہے ہیں، گیارہویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی کے مستشرق سب کے سب عیسائی اوقاف سے تنخواہ پا کر خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرتے رہے، اور اگر وہاں سے ہٹ جاتے تو چپراسی کی تنخواہ بھی شاید نہ پاتے، مگر ان تنخواہ دار مستشرقین نے جو زہر پھیلایا ہے اس کا علاج اگر آپ اجتماعی طور پر نہ کریں گے تو ہمارے نوجوانوں پر زہریلے اثرات ضرور مترتب ہوتے رہیں گے، یہ وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے کہ ہم دنیا کو سمجھائیں کہ اسلام وہ نہیں ہے جو مستشرقین پیش کرتے ہیں، اسلام وہ ہے جو تھا اور واقعی ہے، مستشرقین کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں گہری لیاقت نہیں ہوتی، میرا تجربہ ہے کہ عیسائی مشنریوں میں کسی کا ایمان عیسائیت پر نہیں ہے، صرف ان کو اپنی تنخواہ پر ایمان ہے، لیکن ان کا ایمان کچھ بھی ہو، وہ جو زہر پھیلا رہے ہیں، اس کا تریاق ہم کو برابر پیش کرتے رہنا چاہیے، ہم آپ کے لیے دعا کرتے ہیں، اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل
پاکستان

مفتی صاحب پاکستان کے اسلامی نظریاتی کونسل کے اہم رکن ہیں، وہ اسٹیج پر مدعو کیے گئے تو اپنی جاندار آواز میں فرمایا کہ دارالمصنفین سے میرا تعارف میرے بچپن کے زمانہ سے ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے کہ ابتدا ہی سے میرا تعلق اہل علم سے رہا، اسی بنا پر بچپن سے اب تک اس ادارہ کا معتقد رہا ہوں، اس کی علمی خدمات کی قدر کرتا ہوں اور اس کی کتابیں پڑھنے کے بعد اس کے لیے دعائیں بھی کرتا ہوں، مستشرقین کیا کچھ کر رہے ہیں، اس کا علم ہے، لیبان کی کتاب تمدن عرب کی بڑی شہرت ہے، لاہور میں یہ کتاب تیسری بار شائع ہو چکی ہے، مگر اس میں جو حصہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے اس کو پڑھ کر دوبارہ نہ پڑھ سکا، اس نے جو کچھ لکھا وہ تو اپنی فطرت کی بنیاد پر لکھا، لیکن مجھ کو اس پر حیرت ہوئی کہ اس کے مترجم نے جا بجا بڑے بڑے حواشی

لکھے ہیں، مگر جو حصہ حضورؐ کی شان مبارک میں ہے اس پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس اجتماع میں قرارداد یہ بھی ہو کہ یہ کتاب جب کوئی مسلمان ناشر شایع کرے تو اس میں اس حصہ کی پرزور تردید لکھی جائے، میرا تعلق اس وقت ایک قانونی ادارہ سے ہے، اسلامی قوانین کے سلسلہ میں مستشرقین نے بہت ہی لغویت سے کام لیا ہے، انھوں نے ان کو اس طرح غلط شکل میں پیش کیا ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں نفرت اور وحشت پیدا ہو، اور ان کو وہ غیر مہذب قسم کے قوانین سمجھیں، اس سلسلہ میں کچھ کام کرنا ہمارے ذہن میں تھا، لیکن الحمد للہ دار المصنفین کی اس تحریک، اس اجتماع اور اس محفل سے میرے دل میں اس کی ضرورت کا اور احساس بڑھ گیا، اب میں اپنے ادارے کی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ ان مستشرقین کے گمراہ کن خیالات و بیانات کا پورا ادا ہو، میں یہاں آکر انتہائی خوش ہوں، یہاں جو لمحات گذر رہے ہیں، ان کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی لمحات سمجھ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، اور اپنے مقاصد میں کامیاب کرے، اس ادارہ ندوۃ العلماء، دار العلوم دیوبند اور اس ملک کے دوسرے دینی اداروں کو اسی طرح دین کی خدمت سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان کے لیے موانع دور ہوتے رہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی | استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی اس وقت جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی میں ثقافت اسلامیہ کے صدر ہیں، وہ اسٹیج پر بلائے گئے، تو بہت ہی جذباتی انداز میں بولے: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے شروع کروں، تقریباً پچیس (۲۵) برس کے بعد یہاں حاضر ہوا ہوں، میں اپنے ساتھ یادوں کی بارات لایا ہوں، جس میں شہنائیاں بھی ہیں، اور ہاں کچھ نوحے بھی، میں یہیں پیدا ہوا، میرا بچپن یہیں گذرا، میری تعلیم و تربیت کی داغ بیل اسی جگہ ڈالی گئی، ۱۹۵۳ء میں والد مرحوم آخری بار ہندوستان تشریف لائے تھے، تو ندوۃ العلماء کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے انھوں نے ایک شعر پڑھا تھا، وہی میرے جذبات کی

ترجمانی کرسکتا ہے ؎

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

یہ شعر پڑھتے وقت ان پر رقت طاری ہوگئی، کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے کہ دار المصنفین کی تاسیس کا سب سے بڑا سبب مستشرقین کے حملہ کا دفاع تھا، سیرت نبویؐ کی تدوین کا آغاز اسی کام کے لیے ہوا، دار المصنفین کو اس کا حق تھا کہ اس اجتماع کا انعقاد کرے، اگر مجھے معاف کیا جائے تو شاید میں یہ کہوں کہ آج سے بہت پہلے ہونا تھا، لیکن ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، بحمد اللہ بنیاد پڑ گئی، اب کارواں کے آگے بڑھنے کا موقع ہے، والد مرحوم نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جو خطوط لکھے تھے ان میں انھوں نے اپنے حالات وکوائف لکھے تھے، اس کا ایک پیراگراف یہ تھا کہ میں پچھلے پچیس تیس سال سے یورپ اور مستشرقین کے حملوں کا جواب دے رہا ہوں اور اس کا دفاع کر رہا ہوں، حضرت مولانا تھانویؒ نے اس پر تحریر فرمایا تھا کہ جو کام آپ کر رہے ہیں وہ آپ ہی کے قلم سے ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے، کہنا یہ ہے کہ جس مجلس اور جس جگہ یہ کام ہوا تھا، اور جہاں یہ اجتماع آج ہو رہا ہے اس کے بعد امید ہے کہ ان شاء اللہ کوشش اور تیز ہوگی، میری چند تجاویز ہیں، وہ ان شاء اللہ مقالہ کی نشست میں پیش کروں گا اللہ تعالیٰ برکت اور کامیابی عطا فرمائے۔

سید حامد | مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جب اسٹیج پر آئے تو فرمایا کہ یہ مجلس ایک طویل صبر آزما علمی ریاضت کا نقطۂ آغاز ہے، مستشرقین سے ہماری شکایت بجا ہے، لیکن در اصل یہ شکایت ہمیں خود سے ہونی چاہیے، قدرت کا اصول ہے کہ خلاء کو گوارا نہیں کرتی، ہم نے علمی تحقیقات کا دامن ہاتھ سے جانے دیا تو گویا اغیار کو دعوت دی کہ آؤ، میدان تمہارے ہاتھ ہے، نتیجہ ظاہر ہے، میں آپ کا رہین منت ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دی، مجھے اس کا احساس ہے کہ ایک فرد کی حیثیت سے یہ کم سواد ہرگز اس کا مستحق نہ تھا کہ علماء کے اس جلسہ میں شریک ہو سکے، آپ نے مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نمائندے کی

حیثیت سے بلایا ہے، میں یونیورسٹی کی طرف سے آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر اور ارمغان تبریک پیش کرتا ہوں، اور یقین دلاتا ہوں کہ دونوں اداروں کے درمیان جس شرکت کار کی یہ دعوت غماز ہے، ان شاء اللہ وہ فروغ پائے گی اور اس کے نتائج معنی خیز ہوں گے، یہ علمی تعاون مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت اور ان کی دینی فلاح کے لیے ممد و معاون ثابت ہوگا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی | پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سابق سفیر شام نے اس اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وقت کے ایک اہم تقاضے کو انھوں نے پورا کیا، اور سب کی طرف سے یہ فرض ادا ہوگیا، ہر قوم کی تاریخ اور تمدن کی ایک اجتماعی روح ہوتی ہے، مستشرقین نے اسلام پر بہت کچھ کام کیا ہے، لیکن وہ اس کی روح تک نہیں پہونچ سکے ہیں، گو اپنے پُر فریب اور معروضی نقطۂ نظر سے اس کی روح کو مجروح کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، چند غلطیوں کی تصحیح آسان ہے، اگر زہر اس طریقہ سے دیا جائے کہ خام ذہن کو تو تلخی محسوس نہ ہو، لیکن اگر رگ و پے پر اس کے اثرات اتر جائیں تو بہت سخت بات ہے، مستشرقین نے ہماری خودداری اور خود اعتمادی دونوں پر بڑی ضرب لگائی ہے، اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام سرسید احمد خاںؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور علامہ اقبالؒ نے انجام دیا، اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ جس علم کو ہم کھو چکے ہیں اس کو حاصل کرکے پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے، انھوں نے بتایا کہ اپنی خودی کو کھونے کے بعد مسلمانوں نے برسوں نطشے اور یورپ کے مستشرقین کی زنار اپنی گردن میں ڈالے رکھی، دارالمصنفین نے یہ بہت بڑا کام شروع کیا ہے، امید ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی اور رہبری میں یہ کام پورے طور پر انجام پائے گا، مگر یہ پہلی منزل ہے، اس سے مطمئن نہیں ہونا ہے، مستشرقین کے کام بہت عظیم الشان ہیں، اس کے دفاع اور آگے بڑھنے کے لیے بڑے عزم اور ہمت کی ضرورت ہے، مگر امید ہے کہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرکردگی میں یہ عزائم کامیاب ہوں گے۔

ڈاکٹر ابراہیم قریشی | جمیعۃ اسلام بنکاک تھائی لینڈ کے نمایندے جناب ڈاکٹر ابراہیم قریشی اسٹیج پر تشریف لائے تو انھوں نے فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ اس نے ہمیں اس مذاکرۂ علمی میں یکجا کیا، میں امید کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ سے دین اسلام کی بہتر سے بہتر خدمت ہوگی، میں جمیعۃ علمائے تھائی لینڈ کی طرف سے اس موقع پر آپ سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ تھائی لینڈ کے عوام مسلم و غیر مسلم دونوں کسی نہ کسی حیثیت سے دارالمصنفین سے تعلق رکھتے ہیں، میں جب بچہ تھا تو میرے والد بزرگوار نے شبلی اکیڈمی کے بارے میں بتایا تھا، لیکن اس وقت اس کی پوری اہمیت سے واقف نہ ہوسکا، اپنے اسکول کی تعلیم کے زمانہ سے اب تک اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غیر مسلموں کے حلقہ میں جو مسخ شدہ حالات پیش کیے جارہے ہیں، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس کی اصلاح درسی کتابوں اور اچھے لٹریچر کے ذریعہ سے کریں، یہ میری خواہش ہے کہ تنقیدی اور تحقیقی انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھوں، سنہ ۱۹۷۰ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ رابطۂ عالم اسلامی کا مہمان تھا، جب ہم مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہوکر دعا کی کہ "اللہ کے رسول! ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور اخلاص کے ساتھ آپ کی اتباع کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے طاقت دے، علم دے اور وسائل دے کہ میں اس مشکل کام کو انجام دوں، آمین"، میں بھی رو دیا، میری اہلیہ بھی رو دیں، کچھ سال قبل مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ کی جلدیں حاصل کیں، مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس کی زبان بہت عمدہ ہے، اور یہ الفاظ ذخائر سے مالا مال ہے، مگر اردو نہ جاننے کی وجہ سے اس سے استفادہ کرنا میرے لیے مشکل ہے، میں کراچی آیا تو سیرۃ النبیؐ جلد اول کا انگریزی ترجمہ جو جامعۃ الفلاح نے شایع کیا ہے، اور دوسری جلد سبط احمد نے طبع کرائی ہے، ان کو میں نے حاصل کیا۔ اور جب ان کا مطالعہ کیا تو مجھے تو قع ہوئی کہ

اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مجھے پکارو،
میں سننے کے لیے تیار ہوں) اسی کے بعد میں نے اور کتابیں مہیا کیں، خاص کر صحاح ستہ حاصل
کی، جہاں مولانا شبلیؒ نے صرف حوالہ دیا، میں نے پوری حدیث نقل کی اور اس کا ترجمہ دیا، اسی
مناسبت سے میں نے یہ عرض کیا کہ تھائی لینڈ کا تعلق دارالمصنفین سے ہے، میری کتاب کی پہلی جلد
ہجرت کے واقعات تک ہے، یہ تین سال پہلے شائع ہو چکی ہے، دوسری جلد پہلی ہجری سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک ہے، یہ زیر طبع ہے، جو ان شاء اللہ ۱۹۸۳ء تک
شائع ہو جائے گی۔

یہ اسلام کے احیاء کا دور ہے، ہم اپنے ایمان کو قوی بنائیں، ایک مسلمان کا ایمان لا الٰہ
الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہے، ہم الٰہ کے سارے تصورات کو ختم کر کے اپنے دلوں کو پاک
کریں، اور ان میں اللہ کا خیال جاگزیں کریں، تب ہی ہمارا ایمان پختہ ہوگا، اگر ہم یہ نہیں کرتے
تو ہمارے ایمان میں پختگی پیدا نہیں ہو سکے گی، اس کے بعد ہم اس پر عمل کریں۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ — تمھارے لیے اللہ کے رسول میں
اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (احزاب) — بہترین نمونہ ہے۔

تب ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عقیدہ پختہ ہوگا، ہم کو رسول اللہ صلعم کی احادیث پر عمل کرتے
رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ — اور نہ کمزور پڑو اور نہ غم کرو، اگر تم مومن ہو
الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (آل عمران) تو تم ہی سربلند رہو گے۔

ہم نے دارالمصنفین کے ایک کتابچہ میں یہ پڑھا کہ سیرۃ النبیؐ کے ترجمے ترکی اور انگریزی زبانوں میں ہوئے
اور عربی میں بھی کیا جا رہا ہے، اب اس میں یہ اضافہ کر دیا جائے کہ اس کے بڑے حصے کا ترجمہ

تھائی زبان میں بھی ہو گیا ہے، اور ۱۹۷۹ء سے پڑھا جا رہا ہے، شبلی اکیڈمی سے ہم لوگوں کا تعلق
اسی بنا پر ہے۔"

ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری | ڈاکٹر ظفر اسحٰق ظہران کی پٹرولیم یونیورسٹی کی نمایندگی کرنے کے لیے تشریف
لائے تھے، جب وہ اسٹیج پر آئے تو فرمایا: ظہران یونیورسٹی کے مدیر کو اس سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ
موصول ہوا تھا، مگر وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر شریک نہیں ہو سکے، سب سے پہلے ان کی طرف سے
شکریہ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ہماری یونیورسٹی کو بھی یاد کیا، اس موقع پر مجھ کو بھی دعوت نامہ
موصول ہوا، اس کے لیے بھی شکر گزار ہوں، جس جذبہ سے یہ مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے، ہم اس کی
قدر دل سے کرتے ہیں، دارالمصنفین کے کام اور اس کے مقاصد سے عالم اسلام کے ہر خطہ کے لوگ
واقف ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اردو اچھی طرح نہیں جانتے ہیں، وہ سب اس کی قدر
کرتے ہیں، ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ مذاکرہ ہر لحاظ سے کامیاب ہو، ان مختصر الفاظ کے ساتھ میں
آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔

جناب شوکت سلطان | جناب شوکت سلطان صاحب سابق پرنسپل پوسٹ گریجویٹ شبلی کالج اسٹیج پر
بلائے گئے، تو انھوں نے فرمایا: مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرا رشتہ علامہ شبلی مرحوم سے ہے، گو کہ ان کے
پوتی داماد ہونے کی حیثیت سے میرا رشتہ قانونی ہے، مگر میری اہلیہ اور اولاد کو زیادہ فخر ہے کہ ان کا رشتہ
علامہ سے خونی ہے، میں سرزمین شبلی پر معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہوں، خوش آمدید کہتا ہوں،
اھلاً وسھلاً، میں مولانا شبلی کے قائم کردہ شبلی کالج میں تیس ۳۰ برس تک فرائض ادا کرنے کے
بعد ریٹائر ہوا ہوں، اور اب ان کے دوسرے قائم کردہ ادارے شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ
اور عاملہ میں ہوں، یہ تعارف میرے خیال میں کافی ہے، اس تیس ۳۰ سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے
بہت سے کام کرائے ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے، علامہ شبلی مرحوم کے

الفاظ میں "اپنا اُلّو خود کیا گاؤں"۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی سب سے آخر میں صدرِ جلسہ جناب ڈاکٹر یوسف قرضاوی ڈین شریعت فیکلٹی قطر یونیورسٹی نے تقریر کی، جس کو سنتے وقت محسوس ہوتا تھا کہ وہ عربی زبان کے بڑے اچھے خطیب ہیں، اور اپنے ماہرانہ، باوقار اور سنجیدہ اندازِ بیان میں جو کچھ فرما رہے ہیں اس پر ان کو پورا اعتبار اور اعتماد ہے، انھوں نے فرمایا کہ یہاں پر دو رابطے جمع ہوگئے ہیں، ایک تو عقیدہ اسلام کا ہے، اور وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے، دوسرا علم کا ہے جو قوی تر رشتوں کو جوڑتا ہے، ہم نے علم ہی کے ذریعہ سے ہندوستان کے علماء سے واقفیت حاصل کی، ہم ان کی خدمات کے مرہونِ منت ہیں، ہم میں کون ہے جو حکیم الامت شاہ ولی اللہ ابن شاہ عبد الرحیم سے واقف نہیں ہے؟ کون ہے جس نے حجۃ اللہ البالغہ سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے، کون ہے جو کشاف اصطلاحات الفنون سے مستفید نہیں ہوا؟ کون ہے جو کنز العمال سے واقف نہیں ہے؟ کون ہے جو نواب صدیق حسن خان سے واقف نہیں ہے اور ان کی کتابوں کا خوشہ چین نہیں ہے؟ ہم عرب ببانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، کون ہے جو مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو نہیں جانتا ہے؟ کون ہے جو حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی کا رتبہ شناس نہیں؟ ان کو دیکھنے سے پہلے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین سے واقف ہوا، یہ علمائے ہند کے کارنامے ہیں۔

عصرِ حاضر میں سب سے بڑی چیز جو مسلمانوں پر مسلط کی گئی وہ استعماریت ہے، استعماری طاقتیں اپنے ساتھ اپنے افکار و خیالات لائیں جو فوج کشی اور قبضہ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئیں، فوجیں تو وقتی طور پر آتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں لیکن ان کے ساتھ جو افکار و خیالات اور عقائد آتے ہیں ان کے نفع اور ضرر کے اثرات لوگوں کے کردار پر پڑتے ہیں، ہم اس کو فکری یلغار کہتے ہیں، جس میں سب سے زیادہ خطرناک استشراقی تحقیقات ہیں، علمائے اسلام کو بنیادی طور پر مبشرین اور مستشرقین دونوں کا خطرہ لاحق ہے،

عیسائی مبلغین اپنی وضع قطع اور لباس سے پہچان لیے جاتے ہیں، مسلمان ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں، جس مسلمان کے اندر تھوڑی بہت اسلامی حمیت و غیرت ہوتی ہے وہ ان کے جال میں نہیں پھنستا ہے، لیکن مستشرقین کے فریب سے بچنا مشکل ہے، وہ علم کا لباس پہن کر اور تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں تو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور سمجھدار مسلمان بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں، اور ان کی کاوشوں اور تحقیقوں کی داد دینے لگتے ہیں پھر انہی کو مرجع بھی تسلیم کرتے ہیں، یہ مستشرقین اسلام کے خلاف نئے نئے انکشافات کرتے ہیں جن میں اپنی افتراپردازیوں سے بھی کام لیتے ہیں، انھوں نے جمع و ترتیب، تبویب اور فہرست کی تیاری میں مفید کام ضرور انجام دیے ہیں، کتب خانوں میں پڑے ہوئے مخطوطات کو علمائے اسلام سے روشناس کرایا، ان ہی میں طبقات ابن سعد ہے، المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف اور مفتاح کنوز السنۃ جیسی کتابوں سے ان کی عرق ریزی کی نشاندہی ہوتی ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی کتابوں کا تعلق روح سے نہیں ہے، عقائد سے بھی نہیں ہے، سیرت و تاریخ سے بھی نہیں ہے بلکہ اس کے ظاہری اشکال سے ہے، کیونکہ جب عقائد یا اسلامی تاریخ یا روحِ اسلام کا مسئلہ آتا ہے تو پھر ان کے خفیہ عزائم ظاہر ہو جاتے ہیں، ان کا قلم اسلام کے خلاف زہر اگلنے سے رکتا نہیں ہے، انھوں نے اسلام کو تسلیم نہیں کیا، ان کو غزوۂ موتہ، اجنادین اور صلیبی جنگوں میں جو شکستیں ہوئیں ان کو وہ بھولے نہیں اور اس کا بدلہ قلم سے لے رہے ہیں، جس میں وہ بعض اوقات بڑی بھونڈی غلطیاں کر جاتے ہیں، جس وقت میں اپنی کتاب فقہ الزکوٰۃ لکھ رہا تھا تو گولڈزیہر کا وہ مضمون پڑھا جو چھ صفحات پر مشتمل تھا، اس میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں، وہ بہت سی ایسی باتیں لکھ گیا ہے جن کا کوئی مرجع، مصدر یا حوالہ نہیں، ایسے مستشرقین کی تحقیقات سے عالمِ اسلام کے بہت سے محققین متاثر ہوئے، ان ہی میں طٰہٰ حسین کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے الشعر الجاہلی میں گولڈزیہر اور دوسرے مستشرقین کے افکار و خیالات کو صحیح سمجھتے ہوئے جمع کر دیا ہے اور اسے عالمِ اسلام میں پھیلایا بھی ہے، اور نہ جانے کتنے نوجوان

اس سے متاثر ہوئے، علمائے ازہر بھی ایسے اثرات قبول کیے بغیر نہ رہ سکے، ان کی کتابوں کو مرجع قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں احمد امین کا نام لیا جاسکتا ہے، مستشرقین کو اسلام میں اگر کوئی مستحسن چیز اور خوبی نظر آتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو یونانی اور رومی قانون سے ماخوذ ہے، انھیں قرآن اور سنت نبوی میں بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی، اور اگر آتی ہے تو اسے یہودیت اور نصرانیت سے مستعار بتاتے ہیں، ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی مرحوم نے السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی میں گولڈزیہر کی ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا ہے جو اس نے امام زہریؒ کے سلسلہ میں کی ہیں، ان استشراقی کوششوں کو ہندوستانی علماء نے خوب سمجھا ہے، اور ان کے جوابات بھی دیے ہیں، جس طرح مصر میں مفتی محمد عبدہؒ نے الاسلام والنصرانیۃ فی العلم والمدنیۃ میں اور ان کے بعد ان کے خلیفہ علامہ رشید رضا مصری نے اپنے مجلۃ المنار میں پینتیس ۳۵ سال تک ان مستشرقین کی افتراپردازیوں کے جوابات دیے، اسی طرح ہندوستان میں دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء نے اس قسم کی کتابوں کا جائزہ لیا اور جوابات لکھے، اگرچہ ان کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل نہیں ہوسکی ہیں، علامہ شبلیؒ اس دستہ کے روح رواں ہیں، مگر ان کا کارنامہ عربی میں منتقل نہیں ہوسکا، ان کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صرف ایک کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا، ان کی الرسالۃ المحمدیۃ سے ہم نے ان کو پہچانا، ان محققین کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا جائے، ہم اس میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں، ہم اسلام کو صاف، شفاف، اور منقح شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں[1]"۔

یہ کھلا اجلاس جب اپنے پورے وقار کے ساتھ ختم ہوا تو تمام سامعین کے چہرے یہ کہہ رہے تھے کہ جو چیز وہ بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں کرسکتے تھے، وہ ان کو اس پنڈال میں اچھی طرح حاصل ہوگئی، وہ بہت کچھ سیکھ کر اٹھ رہے ہیں، ہر شخص کی زبان پر تھا کہ اس کھلے اجلاس کی جاذبیت فضا

[1] ان تقریروں کا متن تعمیر حیات لکھنؤ کی اس روداد کی مدد سے بھی تیار کیا گیا ہے جو اس میں برابر شائع ہورہی ہے۔

سیمینار کی آیندہ کارروائیوں کی کامیابی کی ضامن ہے، ہر شخص میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا اور چھوٹے بڑے کام کو انجام دینے میں پیش پیش ہوگیا، جناب محمد مسعود خاں صاحب سابق وزیر اتر پردیش اپنی متانت اور خاموشی کے ساتھ ہر جگہ پہونچ کر کسی نہ کسی کام میں مفید مشورے دے رہے تھے، وزارت میں رہنے کی وجہ سے ان میں بڑی سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی ہے، میں ان کا شکر گذار اس لحاظ سے بھی ہوں کہ میری بعض پریشانیوں میں انھوں نے مفید مشورے دیے اور ضرورت کے وقت ٹیلیفون پر دیر تک بیٹھنے کی زحمت گوارا کی، شبلی منزل میں برابر تشریف لاکر یہاں کے کارکنوں کے حوصلے بڑھاتے رہے، کھلے اجلاس کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ناظم جناب ابوالحسن علی فراہی اور جناب احمد محمود نائب ناظم اور جناب عبدالرحمٰن ناصر معتمد مال کو بھی دیکھا کہ وہ اس کی کارروائیوں سے پوری دلچسپی لے رہے ہیں، اس مدرسہ کا تعلق دارالمصنفین سے بڑا گہرا ہے، اس بنا پر ان کی یہ دلچسپی بالکل فطری اور حق بجانب تھی، کھلے اجلاس کے بعد وہاں سے مولانا عبدالمجید ندوی صدر مدرس، دیگر اساتذہ اور کچھ طلبہ بھی آگئے تھے، مدرسۃ الفلاح بلریاگنج کے صدر مدرس مولانا عبدالحسیب اصلاحی اور وہاں کے استاذ مولانا نظام الدین اصلاحی اور مولانا داؤد اکبر اصلاحی نے بھی سارے حقوق ادا کیے جس کی توقع ان سے تھی، یہ سب حضرات اس تقریب کو اپنی تقریب سمجھتے رہے، اور کھلے اجلاس سے متاثر ہوکر سیمینار کی کامیابی پر قبل از وقت مبارکباد دے رہے تھے، مئو کے جامعہ اثریہ دارالحدیث کے شیخ الحدیث مولانا فیض الرحمٰن، شیخ الجامعہ مولانا محمد احمد اثری ناظم جامعہ مولانا فخر العبید اور استاذ مولانا عبداللطیف بھی انتظامی امور سے دلچسپی لے رہے تھے، اور مبارکپور کے مدرسہ احیاءالعلوم کے ناظم مولانا عبدالباری قاسمی، شاہ گنج کے مدرسہ بدرالاسلام کے مولانا محمد عثمان بھی اس تقریب کی کامیابی پر خوش تھے، مئو کے کاغذ محل کے ماسٹر محمد حسن بھی ہر کام میں پیش پیش تھے، اور حیرت اس بات کی ہوئی کہ جناب حکیم محمد مختار اصلاحی نے

بمبئی سے اس تقریب میں شرکت کے لیے ایک لمبے سفر کی زحمت گوارا کی، اس کے لیے ہم سب ان کے بھی شکر گذار ہیں، کھانے کے بعد ظہر کی نماز کے لیے شبلی منزل کی مسجد میں لوگ جمع ہوئے جو اس موقع کے لحاظ سے ہر طرح سجائی گئی تھی، آج سے پچاس سال پہلے نواب مزمل اللہ خاں مرحوم نے اس کے لیے قیمتی دریوں کی جانمازیں اور پردے عطا کیے تھے، جو بڑی حفاظت سے رکھے جاتے ہیں، اس موقع پر ان سے مسجد کو آراستہ کیا گیا تھا، لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس موقع کے لیے بمبئی سیٹھ عبدالغنی اطلس والے نے بڑی خوبصورت اور دیدہ زیب چٹائیاں بھیجی تھیں، جو صحن میں بچھائی گئی تھیں، ان سے مسجد کی رونق دوبالا ہو رہی تھی، اس کے لیے ہم دل سے ان کے شکر گذار ہیں۔

اس مجمع میں مولانا وصی اللہؒ کے خلیفہ اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن مولانا عبدالحلیم صاحب کو دیکھ کر بھی خوشی ہوئی، اس سمینار میں علامہ اقبالؒ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال کی شرکت نہ ہو سکی، حالانکہ آخر وقت تک یہ امید تھی کہ وہ اپنی تشریف آوری سے ہم لوگوں کو ضرور نوازیں گے، اگر وہ آجاتے تو یہاں کے لوگوں کو ان کے دیدار کے اشتیاق کی تشنگی بڑی حد تک دور ہو جاتی اور سمینار میں مزید رونق ہو جاتی، انھوں نے اپنے آخری خط میں تحریر فرمایا کہ حکومت پاکستان کی منشا کے بغیر میرا کسی بھی غیر ملکی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونا ممکن نہیں ہوتا یہ رول ججوں کے لیے خاص طور پر ہے، اعظم گڈھ حاضر ہو کر آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کے لیے معذرت خواہ ہوں، خدا نے چاہا تو کوئی اور موقع فراہم کر دے گا"۔

(باقی)

دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار سے متعلق کچھ اہم خطوط

کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ ۔ مکتب العمید
مرکز بحوث السیرۃ والسنۃ النبویۃ، قطر

۱۴۰۲/۶/۲ھ مطابق ۲۷/۳/۱۹۸۲م

برادر مکرم مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دارالمصنفین دیکھ کر اور "الاسلام والمستشرقون" کے مبارک سمینار کے سلسلہ میں آپ حضرات کی مساعی جمیلہ اور پر خلوص کوششوں کا اندازہ کر کے ہم کو جو خوشی اور مسرت ہوئی ہے، اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، اس سمینار کو منعقد کرنے کے پیچھے جو مقاصد اور مقدس جذبات کارفرما تھے، وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہیں، سمینار کی کامیاب کارروائی کے لیے بھی آپ مبارکباد کے مستحق ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم الشان کام کی قدر و قیمت کا وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن کو اس قسم کے کاموں کو کرنے کا تجربہ ہو چکا ہے۔

میرے محترم بھائی! مجلس دارالمصنفین کی تعریف و تحسین اور اس کی عظمت کے اعتراف کے لیے یہ چند سطریں ہرگز کافی نہیں ہو سکتیں، اس لیے ہم صرف یہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کے اور ہمارے کاموں کو شرف قبولیت بخشے۔

اخی کریم! سمینار کے سلسلہ میں آپ حضرات کی سرگرمیاں خلوص اور گرمجوشی کے ساتھ مہمان نوازی

اور بالخصوص آپ کی اختتامی تقریر جس نے حاضرین کو بہت متاثر اور برانگیختہ کر دیا تھا، نیز اس وداعی تقریر میں جن متلاطم جذبات کے ساتھ آپ نے ہم لوگوں کو رخصت کیا تھا، اسے ہم کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

اخی مکرم! میں آپ تمام لوگوں کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں، خصوصاً مولانا ابوالحسن علی ندوی اور اپنے بھائیوں محمد رابع، سعید الاعظمی اور سلمان ندوی کو، آپ تمام حضرات ہمارے رفقاء ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب اور استاذ علی یوسف محمدی کا سلام بھی قبول فرمائیں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا بھائی: یوسف القرضاوی

ڈین شریعت فیکلٹی و ڈائرکٹر مرکز بحوث السنۃ والسیرۃ النبویۃ

(نوٹ) یہ خط عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

— ۲ —

کراچی ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۲ھ، ۲۶ر فروری ۱۹۸۲ء

حضرت محترم زید مجدکم العالی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میری طرف سے ہدیۂ تشکر و امتنان قبول فرمائیے کہ آپ کے لطف و کرم کی وجہ سے مجھے شہر انسان خیز اعظم گڈھ میں موتمر اسلام و مستشرقین میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور میں آپ کی خدمت میں ارمغان پیش کرتا ہوں کہ بہر لحاظ کامیاب اور بہر طور پر مقصد کانفرنس کے انعقاد پر مجھے یقین ہے کہ اس بیداری کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔

میں اپنے مستقر پر واپس پہونچ گیا ہوں اور اپنے ساتھ اعظم گڈھ سے ان گنت یادیں ساتھ لایا ہوں اور آپ کے گرمیٔ خلوص و انس کے ناقابل فراموش تاثرات سے سرشار ہوں۔

احترامات فائقہ کے ساتھ۔

آپ کا مخلص: حکیم محمد سعید

- ۳ -

ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

۲۷ر فروری ۱۹۸۲ء

مولانا محترم و معظم طال بقاءہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کل رات کو ہم سب رفقائے وفد بخیر و عافیت اسلام آباد واپس آگئے، الحمدللہ میں ۱۰ر مارچ تک اسلام آباد میں رہوں گا، اس کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ کراچی جاؤں گا۔

دارالمصنفین کی طرف سے مہمان داری، اعزاز و اکرام اور برادرانہ سلوک کا اثر سارے رفقائے وفد کے قلوب پر ہے، اور بہت ہی خوشگوار یاد ان کے دلوں میں ان شاء اللہ تعالیٰ تا دیر باقی رہے گی۔

۲۴ر اور ۲۵ر کو ندوہ میں قیام رہا، اور محبت و یگانگت کے ساتھ اعزاز و تکریم کا جو سلوک ندوہ میں ہوا اس سے سبھی متاثر ہوئے، رہا میں، تو مجھے یہ شکایت ندوہ سے رہی کہ:

کرشمہ انقلاب دہر کا ہے اس کو کیا کہیے — کہ خود اپنے ہی گھر میں آج مہماں بن کے آیا ہوں

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب لوگوں کو بخیر و عافیت رکھے۔

مخلص و دعا گو: عبدالقدوس ہاشمی

— ۴ —

فیصل آباد

۲۸ر فروری ۱۹۸۲ء

جناب محترم و مکرم مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب زید مجدہم و دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ ہم چھ رفقاء ۲۵ر فروری کی شام کو لکھنؤ سے پنجاب میل میں سوار ہو کر ۲۶ر کی صبح کو امرتسر پہونچے اور سرحد پار کر کے ۲ بجے لاہور اسٹیشن ٹیکسی کے

ذریعہ پہونچے، اسلام آباد کے پانچ رفقاء تو ڈھائی بجے ویگن میں سوار ہو کر راولپنڈی روانہ ہوگئے، میں لاہور میں رہ گیا اور ۲۷ر کا دن بھی وہاں گذار کر شام کو فیصل آباد آگیا، یہاں مدرسہ کے حالات کی خبر گیری کرکے اور آئی ہوئی ڈاک دیکھ کر اور جواب لکھ کر ان شاء اللہ ۲ر ۳ر کو پشاور جاؤں گا، اور ۷ر تا ۱۰ر اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد آؤں گا، دارالمصنفین کی حاضری، وہاں کا برای العین مشاہدہ جو عرصۂ دراز کی تمناؤں کے بعد حاصل ہوا تھا، اور ایسے علمی مذاکرہ میں شرکت اور اہل علم سے ملاقات کا شرف، یہ ساری چیزیں میرے لیے انتہائی قلبی مسرت وابتہاج کا موجب تھیں، آپ کی مخلصانہ دعوت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ ساری سعادتیں نصیب فرمائیں، آپ نے جس خلوص ومحبت کے ساتھ ہماری پذیرائی فرمائی، مہمان نوازی کی، قدم قدم پر شفقت ومحبت کا مظاہرہ فرمایا، آپ کی ان سب مخلصانہ اداؤں کی یاد ہمیشہ رہے گی، اور ان کا نقش میرے قلب پر مرتسم رہے گا، دارالمصنفین کے لیے، آپ کے لیے، اور آپ کے تمام رفقائے کار کے لیے تہِ دل سے دعائیں کرتا رہوں گا، اللہ تعالیٰ آپ سب کو بخیر وعافیت اور صحت وسلامتی کے ساتھ اسی طرح دین کی خدمت اور علوم دینیہ کی نشر واشاعت کی توفیق نصیب فرمائے اور ہر قسم کے موانع وعوائق کو دور کرکے آپ کو ان خدمات کے سرانجام دینے کے لیے وسائل وذرائع مہیا فرماتا رہے، میں تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، سیرۃ النبیؐ کی ساتوں جلدوں کا ہدیہ آپ کا ایک ایسا بہترین تحفہ ہے جس سے میں خود بھی استفادہ کروں گا اور اپنی اولاد کو بھی بتاکید کہوں گا کہ اس سے استفادہ کرکے آپ سب کے حق میں دعائیں کیا کریں۔

سیمنار کے مقالات چھپ جائیں تو مہربانی فرماکر ایک نسخہ میرے نام مندرجۂ بالا پتہ پر بھی ارسال فرمائیں، تاکہ یہ علمی مقالات محفوظ رکھوں، دارالمصنفین کے تمام رفقاء اور شبلی کالج کے اساتذۂ کرام کو میری طرف سے سلام مسنون پہونچا دیجئے، فقط والسلام خیر ختام۔

احقر سید تاج الدین کاکاخیل مدرسہ اشاعت العلوم جامع مسجد فیصل آباد۔

-۵-

ادارۂ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد

۶ر مارچ ۱۹۸۲ء

سیدی المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ہمارا قافلہ ۲۶ر کی شب بخیر وعافیت اسلام آباد پہونچ گیا، اعظم گڈھ سے لکھنؤ تک کا سفر بوجوہ خاصا تکلیف دہ رہا، اور بعد کے مراحل آسان اور سفر خوش گوار اور آرام دہ رہا، راستہ بھر آپ لوگوں کی عنایات، الطاف، مہمان نوازی اور کرم گستری کے تذکرے ہم لوگ آپس میں کرتے رہے۔

وفد کی صورت میں نمایندگی اور شرکت کی تجویز اور تحریک چونکہ میں نے ہی کی تھی، اس لیے میں نے اس کو اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ اظہار اعتذار وتشکر کی ذمہ داری بھی میں ہی ادا کروں، معذرت اس بات کی کہ مہمان اور مندوب ہونے کی حیثیت میں ہم سے یقیناً کچھ کوتاہیاں ہوئی ہوں گی، بلکہ زیادہ درست یوں ہے کہ ہوئیں، اور شکریہ اس بات کا کہ آپ لوگوں نے ہماری توقع سے بڑھ کر ہماری پذیرائی کی، سردست مجھے اس سے زیادہ لکھنے کا اور آپ کو اس سے زیادہ پڑھنے کا یارا نہیں، دونوں تھکے ہوئے ہیں، آپ لوگ انتظامات کی وجہ سے مسلسل مصروف رہے اور اب تک ہوں گے، ہم لوگ طویل سفر کی وجہ سے درماندہ ہیں، میرا ارادہ ہے کہ اس سفر کی روداد قلمبند کر ڈالوں، بعض اخبارات کی طرف سے اس کی فرمائش بھی ہے، اگر یہ ارادہ پورا ہوگیا تو باقی باتیں آپ تک مطبوعہ شکل میں پہونچیں گی، سیمنار کی کارروائی کی ترتیب وطباعت کا کام آپ کے ہاں سے ہوگا ہی، اس لیے میں اپنی سرگذشت میں اس حصے سے سرسری ہی گذروں گا، دارالمصنفین کے رفقاء اور کارکنوں کو ہماری طرف سے سلام ونیاز، دفتر کی طرف سے پہونچنے کا ٹیلی گرام ۲۷ر کو روانہ کر دیا گیا تھا، اور ہاشمی صاحب نے خط بھی بھیج دیا تھا۔

شرف الدین اصلاحی

لاہور۔

۵ مارچ ۸۲ء

مخدوم و محترم ! السلام علیکم۔

میں آپ کے یہاں سے سیمینار کی خوشگوار یادیں لیے ہوئے بخیریت پہونچ گیا، راستہ میں ایک رات اور تقریباً ایک دن ندوہ میں قیام رہا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بڑا کرم کیا، ندوہ کے تمام شعبے اور کتب خانہ کھلوا کر دکھلایا۔

میں اپنا مقالہ مستشرقین اور علوم اسلامیہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کو دے آیا تھا، مقالہ کے آخری دو صفحات آپ بھی دیکھ لیں، اس میں میں نے بعض نئی باتیں لکھی ہیں جو شاید کسی نے نہ لکھی ہوں، آپ کی مہمان نوازی کی عنایات کے لیے مکرر شکر گذار ہوں، اللہ تعالیٰ دار المصنفین کو آباد اور آپ کا سایہ تا دیر قائم رکھے، کارلایقہ سے یاد فرماتے رہیں، ضیاء الدین صاحب، منصور نعمانی صاحب اور عمیر الصدیق دریابادی صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔ والسلام۔

شیخ نذیر حسین

مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور

—— ۷ ——

وزارت عدل ابوظبی، متحدہ عرب امارات

۲۲ مارچ ۸۲ء

محترم المقام جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، واپسی کے بعد سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، مگر یہاں کے مشاغل کی وجہ سے تاخیر ہوئی، سیمینار کو کامیاب بنانے میں آپ اور آپ کے رفقاء نے جس طرح کوشش کی، اس پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، اللہ کرے یہ مذاکرہ ہر طرح باعث خیر و برکت ہو، یہاں کے مقامی سرکاری ڈیلی اخبار "الاتحاد" میں دار المصنفین کی مختصر خبر شایع ہوئی تھی، اگر دار المصنفین سے متعلق تعارف وغیرہ پہلے مل گیا ہوتا تو اس کو بھی یہاں شایع کرا دیتا، ہمارے عزیز مولوی ارشد سلمہ گھر جا رہے ہیں، ان کے ذریعہ یہ خط ارسال کر رہا ہوں، مولانا ضیاء الدین اور دیگر رفقاء کو سلام مسنون، مذاکرہ کے سلسلہ میں کوئی چیز شایع ہو تو مجھے ضرور بھجوا دیں، حضرت شیخ الحدیث مدفیوضہم کی صحت نسبۃً بہتر ہے۔ والسلام

مخلص : تقی الدین ندوی مظاہری

—— ۸ ——

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲۷ مارچ ۸۲ء

صدیق مکرم و محترم ! السلام علیکم۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، مضمون "مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور، طریقۂ کار کا تجزیہ اور اصلاح حال کی راہ" ارسال خدمت ہے، براہ کرم ایک ہی قسط میں شایع کیا جائے، قسطوں میں اثر جاتا رہے گا۔

سیمینار کی شاندار کامیابی پر ایک بار پھر مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ کی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہے، میں گھر سے نکلنے میں بڑے حیلے اور بہانے کرتا ہوں، لیکن دار المصنفین میں کچھ ایسی کشش محسوس کی کہ اعظم گڈھ جلد از جلد پھر آنے کو جی چاہتا ہے۔ والسلام

نیاز مند : خلیق احمد نظامی

ادبیات

غزل

از جناب وارثؔ ریاضی، چمپارن

چلا چل جادۂ الفت میں، یہ کس کی صدا آئی
کہ پیدا ہوگئی ہے رہ نوردی میں توانائی

خدا جانے چمن میں کس کی آمد کے تصور میں
لبِ گل برگ پہ "موجِ صبا" لیتی ہے انگڑائی

تصور میں وہ جب آئے ہوا محسوس یہ مجھ کو
کہ جنت کی بہارِ جلوہ زا مجھ تک چلی آئی

جنوں کا ہے کرم یہ بھی کہ اکثر راہِ منزل میں
بڑھا دیتی ہے ہمت ہر قدم پہ آبلہ پائی

وہ میرے ضبطِ غم کا معجزہ تھا ان کی محفل میں
تماشا گاہِ حیرت بن گئے میرے تماشائی

قفس لکھا تھا قسّامِ ازل نے میری قسمت میں
چمن کی سیر و بوئے گل طبیعت کو نہ راس آئی

حقیقت سے چمن کی وہ نہیں واقف بہاروں میں
نہ سمجھی جس نے پھولوں کی ہنسی کلیوں کی برنائی

خزاں کی نذر ہو جائے جو وہ گلشن تو کیا غم ہے
ازل سے آج تک جس میں نہ صبحِ پُر بہار آئی

ہوا ہے منکشف مجھ پہ یہ ایامِ مصائب میں
کہ وہ نا آشنا ہیں جن سے ہے میری شناسائی

ہوا نادانیوں سے عشق کا ہر مرحلہ آساں
نہ کام آئی رہِ الفت میں داناؤں کی دانائی

خدا کو کیا وہ پہچانے گا جو خود کو نہ پہچانا
نہ پہچانے گا خود کو جس نے کھو دی دل کی بینائی

کہاں میں اور کہاں ساقی کی بزمِ کیف زا وارثؔ
اُدھر کھینچے لیے جاتا ہے میرا شوقِ رسوائی

مطبوعاتِ جدیدہ

ارشادات و مکتوبات بانیٔ تبلیغ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ | مرتبہ مولانا افتخار فریدی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۵۲، قیمت مجلد بارہ روپے ۱۲ وغیر مجلد دس روپے۔ پتے: (۱) مولانا افتخار فریدی، فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔ (۲) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶۔

مولانا محمد الیاسؒ کی دینی و اصلاحی دعوت کی جانب الحمد للہ اس وقت ہر خطہ کے مسلمان متوجہ ہوگئے ہیں، لیکن عام لوگوں کی کثرت اور کام کے اس قدر پھیلاؤ کی وجہ سے اس کی اصل روح باقی نہ رہ جانے کا اندیشہ بھی ہے، اس کو خود بانیٔ تبلیغ بھی محسوس کرتے تھے، اس لیے وہ اس دینی دعوت کی صحیح نوعیت برابر واضح کرتے رہتے تھے، اور وقتاً فوقتاً اس کے غلط رخ اختیار کر لینے کے خطرے سے آگاہ فرما کر اس کے بارہ میں ضروری اور مفید ہدایات بھی دیتے رہتے تھے، مولانا افتخار فریدی دین کا بڑا درد رکھتے ہیں اور وہ مدتوں اس تحریک میں پیش پیش رہے ہیں، اس لیے اچھی طرح اس کے مزاج شناس ہیں، یہ مجموعہ انھوں نے اس غرض سے شایع کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے اس کام کی نوعیت و نزاکت کو واضح کر کے اسے غلط نہج سے محفوظ رکھا جائے، یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں بانیٔ تبلیغ کے زریں فرمودات و اقوال نقل کیے گئے ہیں، اور دوسرے حصہ میں ان کے خطوط درج ہیں، مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے ان ارشادات و مکتوبات میں دعوت و تبلیغ کے کام کی صحیح نوعیت، ضرورت، اس کی ساخت، خصوصیت، آداب، چھ اصول، کلمہ، نماز، فرائض،

نوافل، اذکار و اوراد، توبہ، ندامت، اعتراف قصور اور دوسرے دینی اعمال و اشغال کی اہمیت بیان کی ہے، قرآن سے رہنمائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کامل، ایمانی و اسلامی زندگی اختیار کرنے، خدمت خلق کو شعار بنانے اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہونے کی تلقین کی ہے، اور رذائل، فواحش، منکرات، معاصی اور صفات ذمیمہ سے بچنے اور تبلیغ کی راہ کے خطرات و وساوس سے آگاہ فرمایا ہے، اس کو پڑھ کر ایمان و یقین اور فکر آخرت میں اضافہ، دین کی جانب رغبت، اس کے لیے قربانی کا جذبہ اور تبلیغ دین کے لیے گھر سے نکلنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، مکتوبات میں ایک مولانا محمد علی جوہرؒ کے نام ہے، اس سے مولانا محمد الیاسؒ کی نگاہ میں ان کی عظمت کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یوروپین اقوام میں تبلیغ اسلام کے لیے مولانا محمد علیؒ کو سب سے زیادہ اہل اور موزوں سمجھتے تھے، اور مسلمانوں کی طرح غیر اقوام کو بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے مضطرب رہتے تھے، اس مجموعہ میں دعوت و تبلیغ کے تعلق سے دین کے مختلف ارکان، اعمال اور اشغال کے متعلق گوناگوں مفید باتیں اور بہت سے علم و تجربہ پر مبنی نکتے بھی بیان ہوئے ہیں، اس لیے ہر مسلمان کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید ہے، اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لیے تو یہ زریں ہدایت نامہ ہے، جسے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے بقول انھیں برابر مذاکرہ کرتے رہنا چاہیے، البتہ مولانا نے یہ ارشادات مختلف مجلسوں میں اور مختلف اشخاص کے سامنے فرمائے تھے، اس لیے ان میں جابجا تکرار ہے، مگر اس کی حیثیت قند مکرر کی ہے، مولانا افتخار فریدی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس کتاب کو مرتب کر کے اس کی افادیت کو عام کر دیا ہے، امید کہ جب اس کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوگا تو اس کی بعض عبارتوں میں جو غموض و خفا ہے، اور بعض جملوں میں سابقہ و لاحقہ کی جو بے ترتیبی ہے، وہ دور کر دینے کی کوشش کر دی جائے گی۔

"ض ۔ ع"

فرائد قاسمیہ: مرتبہ مولانا حافظ سید عبد الغنی پھلاودی، متوسط تقطیع، کتابت و طباعت بہتر کاغذ قدرے بہتر، صفحات ۲۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: ادارہ ادبیات گلی قاسم جان، دہلی ۶۔

مولانا حافظ سید عبد الغنی پھلاودی (م ۱۹۳۲ء) ایک صاحب علم و عمل اور جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، ان کو مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بہت عقیدت و محبت تھی، اس لیے اپنے کتب خانہ میں ان کی تمام مطبوعہ کتابوں کے علاوہ غیر مطبوعہ تحریروں کا بھی ایک ذخیرہ "فرائد قاسمیہ" کے نام سے بڑی تلاش و محنت سے جمع کیا تھا، ان کے پوتے مولانا عبد الغنی نے جب مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کو اپنے جد بزرگوار کا کتب خانہ دکھایا جو اچھا علمی ذوق رکھنے کے علاوہ اکابر کے مکتوبات، ملفوظات، ارشادات اور منقولات وغیرہ کو سلیقہ سے مرتب کرنے اور ان کی دلنشین تشریح و ترجمانی کا بھی خاص ملکہ رکھتے ہیں، تو ان کی نظر اس ذخیرہ پر بھی پڑی، اور انھوں نے اس کے چند قیمتی حصوں کو چھوڑ کر اس پورے مجموعہ کا عکسی فوٹو شایع کیا ہے، "فرائد قاسمیہ" کی اکثر تحریریں کسی شک و شبہہ یا استفسار کے جواب میں لکھی گئی ہیں، ان میں بعض مکاتیب کی صورت میں ہیں، ان سب میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، عقائد اور معقولات کے مسائل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، بعض تحریروں میں عیسائی پادریوں کا جواب دیا گیا ہے، اور بعض شیعوں کے رد میں ہیں، کچھ میں قرآن و حدیث کے تعارض کو رفع اور بعض اشکالات کو حل کیا ہے، اس طرح یہ مجموعہ گوناگوں علمی و دینی مباحث پر مشتمل ہے، اس کا ابتدائی حصہ اردو میں اور آخری فارسی میں ہے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اپنے دور کے متبحر عالم اور مشہور متکلم و مناظر تھے، اس مجموعہ سے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے، شروع میں مولانا نسیم احمد فریدی کا مفید اور جامع مقدمہ ہے، اس میں "فرائد قاسمیہ" کے مباحث کا اجمالی تعارف، مولانا پھلاودی، مولانا نانوتویؒ اور اُن سب حضرات کا مختصر تذکرہ ہے، جن کے نام کے

خطوط اس مجموعہ میں درج ہیں، ایسے نادر مجموعہ کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، اس کے لیے مولانا فریدی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یادگار وحشت: مرتبہ جناب اسحٰق راشد صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، بلا قیمت، پتہ: ڈاکٹر محمد بلال کنوینر وحشت صدی، ۱۳ رپن اسٹریٹ کلکتہ ۱۶۔

گذشتہ برس کلکتہ میں سید رضا علی وحشت کلکتوی کے قدر دانوں نے ان کا صد سالہ جشن منایا اور اس موقع پر یہ یادگار مجلہ بھی شایع کیا، اس کے شروع میں وحشت کے فوٹو، غیر مطبوعہ خطوط، شان خط کا نمونہ اور مختصر خود نوشت حالات درج ہیں، گو یہ مجموعہ مختصر ہے، اور بعض مضامین ہلکے پھلکے ہیں، تاہم "کلام وحشت کا ترقی پسندانہ پہلو" از ل احمد اکبر آبادی "رنگ وحشت" از آغا رشید مرزا دہلوی، "چند یادیں کچھ تاثرات" از رضا مظہری، "میر کاروان وحشت" از شانتی رنجن بھٹاچاریہ، اور "وحشت مرحوم اور ان کی مہارت فن" از تمنا عمادی اچھے اور مفید مضامین ہیں، ان میں وحشت مرحوم کے ضروری حالات، ادبی زندگی، شاعرانہ کمالات اور بعض قومی خدمات کا ذکر ہے، آغا رشید مرزا دہلوی کے مضمون سے ان کے اچھے ادبی ذوق اور حسن تحریر کا اندازہ ہوتا ہے، جمیل مظہری، سالک لکھنوی، شید آ دہلوی، علقمہ شبلی وغیرہ کئی شعراء کا منظوم خراج عقیدت بھی درج ہے، اس یادگار مجلہ کے مرتب جناب اسحٰق راشد کے مختصر تمہیدی مضمون میں تغزل کی لطافت و دل آویزی کے علاوہ اس صدی کے نصف اول کے بعض اکابر غزل گو شعراء کی عظمت کا ذکر ہے کہ انھوں نے پروفیسر کلیم الدین احمد کی اردو غزل پر پھبتی اور غزل گوئی کے خلاف ترقی پسند و جدیدیت کی مخالفانہ مہم کے باوجود اسے اردو شاعری کی آبرو سمجھا ہے، انھوں نے آخر میں وحشت کے سو منتخب اشعار بھی دیے ہیں، جناب وحشت اردو کے ممتاز غزل گو شاعر تھے، اس لحاظ سے ان کی یادگار میں شایع ہونے والے مجلہ کو زیادہ باوقار ہونا چاہیے تھا اور اس میں کلکتہ سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کی نگارشات ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے تھا، تاہم یہ یادگار مجلہ بھی سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اور فائدہ سے خالی نہیں۔ "ض"

جلد ۱۲۹ ماہ رجب سنہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۸۲ء عدد ۵

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد